ترجمہ: اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور دوست نہ بناؤ۔

اگر کوئی غیر مسلم حکومت کسی اسلامی حکومت پر حملہ کرے تو دنیا کے تمام اسلامی ممالک کا فرض ہے کہ وہ مسلم حکومت کی مدد کریں۔ اسلامی حکومت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ مسلمان جہاں مظلوم، کمزور اور غلام ہیں انہیں آزادی دلائی جائے۔(۴۰)

تاریخ انسانی میں میثاقِ مدینہ ریاست کے تحریری آئین کی حیثیت سے ایک اہم دستاویز ہے جو اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے اصول فراہم کرتا ہے۔ میثاقِ مدینہ کی درج ذیل دفعات وضاحت کرتی ہیں:

دفعہ۱۴: اور کوئی صاحبِ ایمان (مسلمان) کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور کسی کافر کی کسی مسلمان کے خلاف مدد نہ کرے گا۔

دفعہ۱۵: اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے (مسلمانوں) کا ادنیٰ ترین فرد کسی کو پناہ دے دے تو سب پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ اور ایمان والے باہم بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل ہیں۔

دفعہ۱۷: اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا۔ جب تک کہ (صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

دفعہ۱۹: اور اللہ کے راستے میں جو خون بہے گا اس میں سارے مسلمان برابر کے شریک ہوں گے یعنی مل کر بدلہ لیں گے۔(۴۱)

۵۔ عالمی امن کا قیام:

اسلامی حکومت کے تمام معاملات صلح اور امن پر طے ہونے چاہئیں کیونکہ اسلام صلح اور امن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی میں ہر رنگ میں امن کی روح قائم رہنی چاہیے۔(۴۲) اسلامی مملکت کی خارجہ پالیسی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہمیشہ حق کی حمایت کی جائے اور ظلم کی مخالفت کی جائے۔ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لیے دی گئی کہ عدوان اور ظلم کو روکا جائے۔(۴۳) ارشادِ ربانی ہے:

''أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ''(۴۴)

ترجمہ: اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

جہاں جنگ کی اجازت دی ہے وہاں طمع، انتقام اور کمزوروں پر ظلم وزیادتی سے منع کیا ہے۔ اور مظلوم کی حمایت اور دادرسی کے لیے آخری حد تک جانے کا حکم دیا ہے۔(۴۵)(۴۶) ظالموں سے تعلقات کی نوعیت کے حوالے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے۔(۴۷) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى اِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَ لَّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ''(۴۸)

ترجمہ: وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے۔ اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہ ظالم ہیں۔

۶۔ اسلام کے پیغام کی اشاعت اور دعوت:

اسلام کے پیغام اور تعلیم کی اشاعت اور دعوت امتِ مسلمہ کا مقصد اور ذمہ داری ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَر''(۴۹)

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں اسلامی خارجہ پالیسی کا ایک اصول مقرر کیا گیا ہے۔ وہ یہ جو سچائی رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں یعنی اسلامی حکومت اسلام کی مبلغ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتی جو اسلام کی تعلیم کے منافی ہو۔ بین الاقوامی سطح پر ایک اسلامی مملکت کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو عام کرے اس کے لیے تمام وسائل

بروئے کار لائے۔

اسلامی ریاست کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں کا ہدف نظریہ اسلام کی خدمت ہونا چاہیے اور جو ممالک اور اقوام نظریہ اسلام کی بابت دوستانہ یا کم از کم غیر مخالفانہ رویہ رکھتے ہوں ان کے لیے اسلامی ریاست کی پالیسی دوستانہ یا غیر مخالفانہ ہی ہونی چاہیے۔اس طرح جن ممالک اور اقوام کا رویہ اسلام سے دشمنی وعناد کا ہو تو ان سے دوستی کا معاملہ رکھنا تحفظِ دین کے ہدف سے ہم آہنگ نہ ہوگا۔

۷۔ تحفظِ ریاست اور مملکت کا اندرونی استحکام:

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اپنی سرحدوں کی حفاظت پر مبنی ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے تمام تر مسائل کے باوجود مدینہ کی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت پر بہت توجہ دی۔جارح قوم سے پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔(۵۰) سرحدوں کی حفاظت سے متعلق قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اصبِرُوا وَ صَابِرُوا وَ رَابِطُوا''(۵۱)

ترجمہ:اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ (سرحدوں کی) حفاظت کرو۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔اسلامی ریاست کا تحفظ وخود مختاری اور سرحد کی حفاظت ایک اہم ذمہ داری ہے۔بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے کا موقعہ دینے کے بجائے آگے بڑھ کر سرحد پر اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کرے۔رسول اللہ ﷺ کے دور میں تبوک کا پر صعوبت سفر اسی مقصد کے لیے کیا تھا۔اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی احترامِ انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری پر مبنی ہے اسلامی ریاست پر یہ فرض ہے کہ جہاں انسانیت کی ذلت ہو رہی ہو۔عوام مظلومیت کا شکار ہوں تو ان کی مدد کی جائے۔کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی ہو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو کر اکثر قلیل اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے ریاست کا داخلی استحکام بہت ضروری ہے۔پہلی اسلامی ریاست (ریاستِ مدینہ) اپنے قیام کے وقت یہود ونصاریٰ اور انصار کے دو گروہوں اوس اور خزرج کی پرانی

عداوت کی وجہ سے عدم استحکام کے خدشات سے دوچار تھی، دفاع مدینہ کے لیے ضروری تھا کہ ان تمام فرقوں اور گروہوں کو ایک سیاسی وحدت میں پرو دیا جائے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے اس کی کوشش کی اور تمام فریقوں کو ایک معاہدے پر متفق کیا۔ اس معاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ مدینہ میں پرامن زندگی بسر کرنے اور قوت و طاقت اور عسکری وسائل کو فراہم کرنے میں اچھی طرح کامیاب ہو گئے۔ یہ معاہدہ میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے یہ معاہدہ دورِ حاضر میں اسلامی ریاست کے داخلی استحکام میں ایک اہم اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ (۵۲)

۸۔ فنونِ حرب میں ترقی و استفادہ:

اگر کسی ملک کے پاس مضبوط فوج نہ ہو تو دشمن کے لیے اس کا شکار کرنا آسان ہوتا ہے، اس کے برعکس مضبوط فوج ہو تو دشمن اس کی سنتا ہے اور اس کا احترام کرتا ہے۔ (۵۳) اس سلسلے میں سلطنتِ عثمانیہ کی مثال سامنے ہے کہ جب تک وہ طاقت ور رہے اس وقت تک کسی میں ہمت نہیں تھی کہ عثمانیوں کو للکار سکیں مگر جیسے یہ عثمانی سلطنت انتشار کا شکار ہوئی مغربی ممالک نے عثمانیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس لیے قرآن مجید میں قوت کو ہمہ وقت تیار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ الانفال میں اللہ کا ارشاد ہے:

''وَ اَعِدُّوا لَهُم مَّا استَطَعتُم مِّن قُوَّةٍ وَّمِن رِّبَاطِ الخَيلِ تُرهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُم وَ اٰخَرِينَ مِن دُونِهِم لَا تَعلَمُونَهُم اَللهُ يَعلَمُهُم'' (۵۴)

ترجمہ: اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

جنگ کے سلسلے میں اسلام نے ایک قوت و طاقت کا مظاہرہ اور دوسرے رباط کا بندوبست اسلحہ اور سامان پر زور دیا ہے۔ اس طرح اسلام اسلحہ سازی کے لیے معالِ حربیہ کا سامان بہم پہنچانے کی بھی ترغیب دیتا ہے اور فولاد و آہن کا بطورِ خاص اس سلسلہ میں ذکر کرتا ہے کہ عسکری اغراض کے لیے اس سے استفادہ کیا جائے۔ (۵۵)

۹۔ سفیروں کے تحفظ کی ضمانت:

اسلامی ریاست سفیروں اور قاصدوں کی جان کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا حکمران اس اصول کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف فوجی کاروائی کی جائے۔ عہدِ نبوی ﷺ میں آپ ﷺ کے سفیر اور قاصد کو بلقا کے حاکم نے شہید کر ڈالا تو آپ ﷺ نے ان کا انتقام لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا غزوہ موتہ اسی سلسلہ میں پیش آیا۔ امام سرخسی نے شرح السیر الکبیر یہ اصول بین کیا ہے کہ: ''ان الرسول من الجانیبین یکون آمنا من غیر استیمان ''ترجمہ: یعنی فریقین کی طرف سے (عین حالتِ جنگ میں بھی) آنے والا ایلچی بغیر امان لیے بھی محفوظ ہوگا۔ چنانچہ جب مسلمہ کذاب کے دو ایلچی اس کا خط لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے دعویٰ نبوت کے بارے میں آپ ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم خود اس کے دعویٰ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو وہ کہتا ہے تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر ایلچیوں کے قتل نہ کیے جانے کا اصول نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اُڑوا دیتا۔(۵٦)

خلاصہ بحث:

اسلام جہاں قانون کی بالادستی عدل وانصاف کی فراہمی، تہذیب تمدن کی تعمیر وتطہیر اور فلاحی معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے، وہاں بیرونی تعلقات میں بھی انسانیت کی حفاظت اور امن سلامتی کو بھی ترجیح اوّل بنایا ہے۔ اسلامی مملکت مساوات کی بنیاد پر ہی دنیا سے تعلقات استوار کرتی ہے، اسلام اسی نظریہ وعقیدہ کی بنیاد پر دنیا کو مل بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے، اور یہی اسلام کے بین الاقوامی قانون کی اساس ہے جس پر اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں سے تعلقات منظّم ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں کا ہدف نظریہ اسلام کی خدمت ہونا چاہیے۔ اور جو ممالک اور اقوام نظریہ اسلام کی بابت دوستانہ یا کم ازکم غیر مخالفانہ رویہ رکھتے ہوں ان کے لیے اسلامی ریاست کی پالیسی دوستانہ یا غیر مخالفانہ ہونا چاہیے۔ اس طرح جن ممالک اور اقوام کا رویہ اسلام سے دشمنی وعناد کا ہو تو ان سے دوستی کا معاملہ رکھنا تحفظِ دین کے ہدف سے ہم آہنگ نہ ہوگا۔ بین الاقوامی تعلقات میں اسلام ریاستی معاہدات کی پاسداری کو نہ صرف قانونی ذمہ داری قرار دیتا ہے بلکہ یہ اخلاقی اور دینی ذمہ

داری اور ایمان کا تقاضہ ہے۔ ایک اسلامی مملکت کو صرف بین الاقوامی معاہدہ ہی پیشِ نظر نہیں رکھنا ہوگا بلکہ اسے معاہدات کی پابندی شریعتِ اسلامی کی بناء پر کرنا ہوگی خواہ اس کی صراحت بین الاقوامی معاہدہ میں نہ بھی ہو۔ اسلامی مملکت کو غیر اسلامی ممالک سے تعلقات سے قائم کرنے میں ایک نہایت اہم بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ تعلقات ایک قسم کی صلح ہیں لیکن یہ صلح کا مطلب محبت، دوستی نہیں ہے کیونکہ بنیادی طور پر شریعت نے غیر مسلموں کو اپنا رازداں بنانے سے منع کیا ہے الاّ یہ کہ کسی معاملہ میں ان کی نیک نیتی واضح ہو۔ اسلامی مملکت کو بین الاقوامی مسائل، مثلاً تخفیف اسلحہ، حقوقِ انسانی کا تحفظ، بین الاقوامی تنازعات کا پُرامن حل، نسلی امتیازات، کمزور اقوام کے استحصال جیسے اہم مسائل میں سنجیدہ کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ امنِ عالم کے لیے کوشش کرنا دینی فریضہ ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ وہ عسکری، اقتصادی اور معنوی وسائل سے لیس ہو اور ہر لحاظ سے تیار ہو تاکہ دشمن پر خوف اور رعب و دبدبہ قائم رہے اور وہ کسی جارجیت کا سوچ بھی نہ سکے اسے انسانی حقوق کو پامال کرنے کی جرأت نہ ہو اور نہ وہ کسی کی جان و مال پر دست درازی کر سکے اگر جنگی صورتحال ہو تو پھر ایک اسلامی ریاست کو باقی جنگی کاروائیوں، قیدیوں اور عام شہریوں کے سلسلے میں شریعتِ اسلامیہ کی ہدایات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

اسوۂ رسول ﷺ سے دورِ جدید کے حوالے سے جو فکر انگیز روشنی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خارجہ پالیسی میں رواداری، امن اور صلح کے لیے بین الاقوامی معاہدوں کو بنیاد بنایا۔ اگر ناگزیر جنگ کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں امن و سلامتی کے سارے ممکنہ ذرائع کو ترجیح دی۔ جنگ کے آداب، اس میں اخلاقی حدود و قیود، محاربین کے باہم حقوق و فرائض، معاہدین اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ برتاؤ اور مفتوح اقوام کے ساتھ واضح راہیں متعین کر دیں۔ جنگ میں ہر چیز کو جائز سمجھنے والی خونخوار اقوام کو آپ ﷺ نے جنگ کے آداب بھی سکھا دیے ہیں۔ اگر آج بھی سیرت طیبہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے شریعت کو اصولوں کو نافذ کیا جائے تو دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

مراجع وحواشی:

(۱) ورک، ڈاکٹر محمد اکرم، ''بین الاقوامی تعلقات کے اصول، حدود اور تقاضے (سیرت طیبہ کی روشنی میں)''، مشمولہ: ضیائے تحقیق، ششماہی، ۲۰۱۱ء، ج ۲ ش ا ص ۱۰۲۔

(۲) ایضاً ص ۱۰۳ تا ۱۰۴۔

(۳) طارق، ڈاکٹر حافظ محمد، ''بین الاقوامی تعلقات اور اسلامی تعلیمات''، مشمولہ: مجلّہ علومِ اسلامیہ، سالانہ، ۲۰۱۴ء، ش ۱۹، ص ۱۱۱۔

(۴) ایضاً، ص ۱۱۲۔

(۵) القرآن ۸:۶۰۔

(۶) طارق، ڈاکٹر حافظ محمد، ''بین الاقوامی تعلقات اور اسلامی تعلیمات''، مشمولہ: مجلّہ علومِ اسلامیہ، سالانہ، ۲۰۱۴ء، ش ۱۹، ص ۱۱۲۔

(۷) احمد، ڈاکٹر مطلوب وگورایہ، محمد انس، ''اسلامی ریاست میں تصّور قومیت اور بین الاقوامی تعلقات''، مشمولہ: القلم، ششماہی، دسمبر ۲۰۱۵ء، ج ۲ ش ۲۰، ص ۲۲۷۔

(۸) ہاشمی، معین الدین، ''باجگذ ارانِ روم و فارس سے معاہداتِ نبوی (قبائل کی شیرازہ بندی)''، مشمولہ: فکر ونظر، سہ ماہی، ۲۰۰۰ء، ج ۴، ش ۳۷، ص ۳۔

(۹) عقدِ مواخاۃ کے ذریعے حضرت محمد ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ہر قسم کی ایسی دیواروں کو گرادیا جو اتحاد و اتفاق اور باہمی تعلق کے راستے میں روکاوٹ کا سبب تھیں۔ مثال کے لیے ملاخطہ ہو سورۃ الحشر: ۹، تفصیل کے لیے ملاخطہ ہو مودودی، سید ابوالاعلی، تفہیم قرآن (اردو)، جلد ۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۹۵۔

(۱۰) مبارکپوری، مولانا صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المکتبہ السّلفیہ، لاہور، پاکستان، جدید ایڈیشن، مئی ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۳۔

(۱۱) ہاشمی، معین الدین، ''باجگذ ارانِ روم وفارس سے معاہداتِ نبوی (قبائل کی شیرازہ بندی)''، مشمولہ: فکر ونظر، سہ

ماہی، ۲۰۰۰ء، ج ۴، ش ۳۷، ص ۴

(۱۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ابنِ ہشام، عبدالملک و ابنِ یسار، محمد اسحاق، سیرت النبی ﷺ، جلد ۳، مترجم: احمد، مولانا قطب الدین، اسلامی کتب خانہ، لاہور، س ن، ص ۹۹ تا ۱۱۱۔ الطبری، علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخِ طبری (اردو)، ج ۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، آفسٹ ایڈیشن، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۵ تا ۲۵۷۔

(۱۳) شاہ حبشہ نجاشی کی طرف اس مکتوب کی تاریخ کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حمید اللہ، ڈاکٹر، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۴۔

(۱۴) طبری، علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخِ طبری (اردو)، ج ۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، آفسٹ ایڈیشن، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۳ تا ۲۷۲۔

(۱۵) ہاشمی، معین الدین، ''باجگذارانِ روم و فارس سے معاہداتِ نبوی (قبائل کی شیرازہ بندی)''، مشمولہ: فکر و نظر، سہ ماہی، ۲۰۰۰ء، ج ۴، ش ۳۷، ص ۴۔

(۱۶) ابنِ سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۵۷ تا ۲۵۸۔

(۱۷) ابنِ ہشام، عبدالملک و ابنِ یسار، محمد اسحاق، سیرت النبی ﷺ، ج ۴، ص ۲۵۵۔

(۱۸) ابنِ سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۳۱۲۔

(۱۹) ایضاً، جلد ۱، ص ۲۲۶۔

(۲۰) طارق، ڈاکٹر فرید الدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج ۲، ش ۲۰، ص ۴۵۔

(۲۱) ایضاً، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

(۲۲) القرآن ۳: ۱۱۰۔

(۲۳) طارق، ڈاکٹر حافظ محمد،''بین الاقوامی تعلقات اور اسلامی تعلیمات''، مشمولہ: مجلّہ علومِ اسلامیہ، سالانہ،۲۰۱۴ء، ش ۱۹، ص۱۱۳۔

(۲۴) القرآن ۴۹:۱۳۔

(۲۵) طارق، ڈاکٹر حافظ محمد،''بین الاقوامی تعلقات اور اسلامی تعلیمات''، مشمولہ: مجلّہ علومِ اسلامیہ، سالانہ،۲۰۱۴ء، ش۱۹، ص۱۱۴۔

(۲۶) القرآن ۲:۲۰۸۔

(۲۷) القرآن ۶:۸۲۔

(۲۸) طارق، ڈاکٹر حافظ محمد،''بین الاقوامی تعلقات اور اسلامی تعلیمات''، مشمولہ: مجلّہ علومِ اسلامیہ، سالانہ،۲۰۱۴ء، ش ۱۹، ص۱۱۳ تا ۱۱۴۔

(۲۹) القرآن ۱۷:۷۰۔

(۳۰) طارق، ڈاکٹر فرید الدین،''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ص۴۶۔

(۳۱) ایضاً، ص۴۷۔

(۳۲) القرآن ۵:۸۔

(۳۳) طارق، ڈاکٹر فرید الدین،''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص ۴۷۔(۳۴) القرآن ۱۷:۳۴۔

(۳۵) طارق، ڈاکٹر فرید الدین،''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص۴۷۔

(۳۶) ایضاً ص، ۴۸۔

(۳۷) القرآن ۸:۵۸۔

(۳۸) طارق، ڈاکٹر فریدالدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناضر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص ۴۹ تا ۵۰۔

(۳۹) القرآن ۳:۲۸۔

(۴۰) ابوزہرہ، العلاقات الدولیہ فی الاسلام، ص ۲۳۸ تا ۲۴۱۔

(۴۱) ابنِ ہشام، عبدالملک وابنِ یسار، محمد اسحاق، سیرت النبی ﷺ، ج ۴، دارالجیل، ص ۲۵۵۔

(۴۲) دیکھیئے سورۃ الانفال: آیت ۶۱۔۶۲۔

(۴۳) طارق، ڈاکٹر فریدالدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناضر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص ۵۱۔

(۴۴) القرآن ۲۲:۳۹۔

(۴۵) طارق، ڈاکٹر فریدالدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناضر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص ۵۲۔

(۴۶) دیکھیئے سورۃ النساء: آیت ۷۵۔

(۴۷) طارق، ڈاکٹر فریدالدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناضر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲، ش۲۰، ص ۵۲۔

(۴۸) القرآن ۶۰:۹۔

(۴۹) القرآن ۳:۱۱۰۔

(۵۰) طارق، ڈاکٹر فریدالدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناضر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء،

ج۲،ش۲۰،ص۵۷۔

(۵۱) القرآن۳:۲۰۰۔

(۵۲) طارق، ڈاکٹر فرید الدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲،ش۲۰،ص۵۷تا۵۸۔

(۵۳) ایضاً، ص۵۹۔

(۵۴) القرآن ۸:۶۰۔

(۵۵) طارق، ڈاکٹر فرید الدین، ''اسلامی مملکت کے بین الاقوامی تعلقات (عصرِ حاضر کے تناظر میں)، ششماہی، ۲۰۱۵ء، ج۲،ش۲۰،ص۵۹۔

(۵۶) ایضاً

پاکستان کے مسلم فیملی لاء کی دفعہ ۴ ’’یتیم پوتے کی میراث‘‘
تحقیقی جائزہ

تہمینہ پرویز*

مسلم پرسنل لاء کے اختلافی دفعات میں سے ایک دفعہ یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق ہے۔شریعتِ اسلامی میں وراثت کے قوانین اللہ تعالی نے بصراحت بیان کیے ہیں۔ ہر حقدار کا حصہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں متعین فرمایا۔اور ایسا کامل و اکمل نظام دیا جس کی نظیر نہ پہلے کسی مذہب یا قوم کے قانون نے دی، نہ اس کے بعد۔اور یہ حصص مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهِ كَانَ عَلِيْماً حَكِيْماً

’’یہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حصے ہیں۔ بلاشبہ اللہ علیم (تمام حقیقتوں کو جاننے والا) اور حکیم (یعنی حکمتوں سے معمور) ہیں۔‘‘

پاکستان کے مسلم فیملی لاز میں یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دیا گیا۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر تیرہ سو برس تک پوری امت مسلمہ متفق رہی ہے کہ یتیم پوتے کو میت کی اولاد (مذکر) کی موجودگی میں حصہ نہیں دیا جاتا۔قرآن وحدیث اور اجماع صحابہؓ کی وجہ سے یہ مسئلہ اتنا متیقن اور قطعی ہے کہ اس میں کسی مسلمان کے لئے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔لیکن یورپ کے دانش وروں اور مستشرقین کے اعتراضات کے سبب یہ غیر شرعی قدم اٹھایا گیا۔

زیرنظر مقالہ میں یتیم پوتے کی وراثت سے محرومی کا مفصلاً جائزہ لیا گیا ہے کہ ہمارے آرڈی نینس کی یہ دفعہ کس طرح قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

آرڈی نینس کی یہ دفعہ نمبر ۴ میں درج ہے کہ:

’’اگر وارثت کے شروع ہونے سے پہلے مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہوجائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی زندہ ہوں) رسدی وہی حصہ ملے گا جو اس لڑکی یا لڑکے کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔‘‘(۱)

☆ ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک لرننگ، کراچی یونیورسٹی

اس دفعہ کی شرح میں درج ہے کہ:

''اس دفعہ کا مفاد تمام ورثاء کو ملے گا چاہے وہ پاکستان کے شہری ہوں یا بیرون ملک کے'' (پی ایل ڈی ۱۹۶۸ء ۵۲۰ = (پی ایل ڈی ۱۹۶۸ء کراچی ۴۸۰)

اس دفعہ کا اطلاق پہلے فوت شدہ پسران اور دختران کے پسران پر ہوتا ہے نہ کہ متوفی کہ ہمشیرہ کے بیٹے پر (پی ایل ڈی ۱۹۶۸ء، مغربی پاکستان ۶۸ نیز پی ایل ڈی ۱۹۶۶ء ,۸۱ اور پی ایل ڈی ۱۹۶۴ (ریونیو) ۹۴)

وراثت کے آغاز سے مراد یہ کہ جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے یا جب رواج کے تحت تاحین حیات یا نکاح ثانی وغیرہ کا عارضی حق ختم ہوجاتا ہے۔ (پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء، لاہور ۴۲۰)

فوت شدہ لڑکے اور لڑکی کی اولاد کے بارے میں وراثت کے احکام کا اطلاق صرف مسلمان پاکستانی شہریوں پر ہوتا ہے۔ (پی ایل ڈی ۱۹۶۸ء، لاہور ۵۲) (۲)

۱۹۷۸ء میں اس میں مذید اضافہ کیا گیا کہ

''مورث کی وفات سے قبل فوت ہوجانے والے پسران اور دختران کی اولاد کو اپنے ماں یا باپ کا حصہ بحصہ اسلامی ملتا ہے۔ ایسے فوت شدہ پسران یا دختران کی بیوہ یا شوہر کو اس کے حصے سے کچھ نہیں ملے گا۔ (پی ایل ڈی ۱۹۷۸ء ،لاہور ۴۸۳)'' (۳)

۱۹۹۰ء میں اس دفعہ کا مقصد واضح کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

''آرڈی نینس کی دفعہ ہذا موقعہ فراہم کرتی ہے کہ مورث سے مرنے والے شخص کی اولاد لڑکی یا لڑکے (پوتے) کو شرعی اسلامی حق دلانا ہے۔ اور اس کا مقصد (Intentions) ان کا حصہ اسلامی کو شرعی حد سے بڑھانا نہیں ہے۔ (پی ایل ڈی ۱۹۹۰ء ایس سی ۱۰۵۱) '' (۴)

مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

''وارثت میں سے پوتے کو جو کہ اسے اپنے والدین کی طرف سے حصہ ملتا ہے اس سے بڑھ کر حصہ لینے کا حقدار نہ ہوگا۔''

جائیداد متناسب حصص کے ذریعے تقسیم ہوگی جو کہ انہیں آباواجداد اور دیگر قانونی وارثان جو کہ مختلف ذرائع سے کہتے ہیں اپنے اپنے حصہ کے حق دار ہوں گے۔ (پی ایل ڈی ۱۹۹۰ء، ایس سی ۱۰۵۱)

پہلے مرنے والے کی اولاد لڑکا یا لڑکی کے حق کو دفعہ ہذا بحال کرتی ہے۔ بیشتر ازیں آرڈینس کے اطلاق سے قبل بوقت قانون

وراثت میں بھی لڑکا/ پوتا مستحق نہ تھا۔(اے ایل ڈی ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۱۸(۲)) (۵)

۲۰۰۰ء میں وفاقی شریعت کورٹ نے اس دفعہ کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے صدر پاکستان کو ہدایت دی کہ اس قانون میں ترمیم کی جائے۔ وفاقی شریعت کورٹ کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔

> ''مسلم عائلی قوانین آرڈیننس، ۱۹۶۱ء دفعہ (۴) میں موجود احکامات جو کہ فی الوقت نافذ العمل ہیں وہ اسلامی احکامات کے برخلاف ہیں۔ وفاقی شریعت کورٹ نے صدر پاکستان کو ہدایت کی کہ وہ قانون میں ترمیم کرے تاکہ انہیں اسلامی احکامات کے مطابق کیا جا سکے۔ عائلی قوانین آرڈیننس، ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۴ کے احکامات جنہیں اسلامی احکامات کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ وہ ۳۱ مارچ ۲۰۰۰ء سے غیر موثر ہو جائیں گے۔ (پی ایل ڈی ۲۰۰۰ء وفاقی شریعت کورٹ۔ ۱(ایچ)) (۶)''

یہ فیصلہ وفاقی شریعت کورٹ نے اپنایا۔

> ''وفاقی شریعت کورٹ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس بات کی بھی پڑتال کرے کہ آیا مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۱ء کی دفعات ۴، ۵، ۶ اور ۷ اسلامی احکامات کی خلاف ورزی ہیں یا نہیں۔ (پی ایل ڈی ۲۰۰۰ء وفاقی شریعت کورٹ (سی))'' (۷)

اس دفعہ کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ اللہ تعالی کے بنائے ہوئے قوانین میراث حکمت سے بھرپور ہیں سید احمد عروج اپنی کتاب ''اسلام کے عائلی قوانین'' میں لکھتے ہیں کہ

> ''اس مسئلہ کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے کے لئے ہر عقل مند اور منصف مزاج شخص کو سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ میت کے ترکے کو تقسیم کرنے کے لئے کوئی اصول ضرور ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ میراث کی تقسیم الل ٹپ تو نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تقسیم کے اصول کہاں سے حاصل کئے جائیں؟ صرف اپنی عقل سے حاصل کیے جائیں یا رواج سے یا اس کے لیے وحی الٰہی کی رہنمائی کو بھی ضروری قرار دیا جائے؟ اگر صرف عقل پر اعتماد کیا جائے تو انسان کی عقلیں مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں میں تقسیم میراث کے مختلف اصول اور طریقے رائج

ہیں بلکہ ایک ملک کے اندر بھی مختلف طریقے پائے جاتے ہیں۔آخر ہم کس قوم کی عقل پر اعتماد کریں اور کیوں کریں؟ اور اگر ہم صرف اپنی عقل پر ہی اعتماد کریں تو کیا یہ بات صحیح اور قرین انصاف ہوگی کہ ہم اپنی عقل سے گھڑے ہوئے اصول ان لوگوں پر بھی مسلط کرنے کی کوشش کریں جن کی عقلیں ان اصولوں کو غلط سمجھتی ہیں؟ یہی سوال کسی ملک کے رواج کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے بلکہ ایک ملک کے اندر بھی مختلف رواج پائے جاتے ہیں تو کیا کسی ایک رواج کو ان تمام لوگوں پر عائد کرنا صحیح ہوگا جو اسے غلط سمجھتے ہوں یا کسی دوسرے رواج پر عمل پیرا ہیں؟ یہاں آکر ہماری عقل خود یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔اس سے بلند کوئی رہنمائی ضروری ہے۔ہم مسلمان اس پر ایمان لائے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ رہنمائی وحی الٰہی کی رہنمائی ہے۔''(۹)

اللہ کی حکمت کے بارے میں مولانا اصغر حسین ''مفید الوارثین'' میں لکھتے ہیں کہ

''اس مہربان ورحیم مہمان نواز کی مہربانی دیکھو کہ اس کی پسماندہ چیزیں ابتداء ہی سے خود تقسیم نہیں کی بلکہ کچھ عرصے تک اسی رخصت ہونے والے مسافر کو اختیار دے دیا تھا کہ جس طرح مناسب سمجھے اپنے والدین اور رشتہ داروں پر اپنا مال تقسیم کر جائے۔لیکن اس قدر عرصہ کے تجربے سے جب اللہ تعالی نے لوگوں کو دکھلا دیا اور یقین کروا دیا کہ پورا عدل وانصاف انسانی طاقت سے باہر ہے۔رواداری، لحاظ ومروت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بے انصافی ہورہی ہے تو اس انسان مسافر ومہمان کے ہاتھ سے یہ اختیار نکال لیا۔اور اس کام کا خود متکفل ہوا اور اس قدر اہتمام کیا کہ بلا واسطہ ملک مقرب اور بلا تشریح نبی مرسل پر ایک مسافر آخرت کے پس ماندہ مال کو اپنے خاص حکم سے تقسیم فرما کر اس کے پس ماندون کے حصے خود مقرر ومنضبط فرما دیئے۔'' (۱۰)

اللہ تعالیٰ نے اس علم کے ضابطے خود مقرر فرما دیئے تو یہ علم کسی تعارف کا محتاج نہ رہا لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے اس کی اہمیت مزید اجاگر کی گئی۔

علم الفرائض کی اہمیت:

علم الفرائض اجل اور نفیس علوم میں سے ایک علم ہے۔اس کا ہماری زندگیوں میں بھرپور دخل ہے۔اور ہمارے روزمرہ کے

معاملات کے ساتھ اس کا پورا ربط ہے۔ اس لئے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ جس میں اموات واقع نہ ہوتی ہوں اور لوگ وارث نہ بنتے ہوں۔(۱۱)

علامہ علاؤالدین لکھتے ہیں کہ:

''وسمی فرائض لان اللہ تعالی قسمه بنفسه واوضحه وضوح النھاربشمسه''(۱۲)

''یعنی اسے فرائض کہا جاتا ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے خود تقسیم فرمایا اور دن کے سورج کی طرح واضح فرمادیا۔''

حدیث میں اس علم کی اہمیت وفضیلت کو بیان کرتے ہوئے اس کے سیکھنے اور سکھانے پر زور دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

''تعلموا الفرائض وعلموہ فانه نصف العلم وانه ینسی وھو اول ما ینزع من امتی''(۱۳)

''تم فرائض سیکھو اور اس کو سکھاؤ اس لیے کہ یہ آدھا علم ہے اور یقیناً یہ علم بھلا دیا جائے گا۔ اور یہی وہ علم ہے جو سب سے پہلے میری امت سے سلب کر دیا جائے گا۔''

اسی طرح مستدرک میں ہی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

''تعلموا الفرائض وعلموہ الناس فانی امرء مقبوض وان العلم سیقبض

حتی یختلف الا ثنان فی الفریضة لا یجدان احدا یفصل بینھا(۱۴)

''علم الفرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیوں کہ میرا وصال ہونے والا ہے اور علم الفرائض بھی اٹھنے والا ہے۔ یہاں تک کہ فرائض (جائیداد) کے مسئلہ میں دو شخص آپس میں اختلاف کریں گے اور کوئی ایسا عالم نہیں پائیں گے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔''

اور امام بیہقیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ:

تعلموا الفرائض فانه من دینکم (۱۵)

''یعنی تم علم الفرائض سیکھو بے شک یہ تمھارے دین سے ہے۔''

اور سیدنا عمر فاروقؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ یہ جلیل القدر علم لوگوں کو سکھانے کے لئے خود شام تشریف لے گئے۔(۱۶)

اسلامی قانون وراثت کے چند بنیادی اصول:

یتیم پوتے کی میراث کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اسلامی قانون وراثت کے چند بنیادی اصولوں سے واقفیت ضروری ہے۔

قرآن کی آیات اور تشریحی احادیث سے ہمیں جو بنیادی اصول ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ وراثت کا مسئلہ کسی شخص کی موت کے بعد پیدا ہوتا ہے:

وراثت کا استحقاق مورث کی موت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔اس کی زندگی میں کسی شخص کو اس کے مال و اسباب میں حق وارثت حاصل نہیں ہوتا۔اسلامی قانون وراثت کا یہ ایک اہم اصول ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فقہی مذاہب متفق ہیں۔اسلامی شریعت میں میراث کا قصہ شروع ہی ہوتا ہے کسی شخص کی موت کے بعد۔اس کی زندگی میں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کرم میں مسائل میراث سے متعلق جتنی بھی آیتیں ہیں وہ سب میت کے چھوڑے ہوئے مال کو وراثت قرار دیتی اور اس کی تقسیم کے احکام بیان کرتی ہیں۔(۱۷)ان آیتوں نے اس بنیادی اصول کو پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ:

لِلرِّجَا لِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّاتَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (۱۸)

''مردوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔اور عورت کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔''

اسی طرح سورہ النساء میں موت کی صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ:

اِنِ امْرُؤٌھَلَکَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَاتَرَکَ(۱۹)

''اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو جو کچھ اس نے چھوڑا ہے اس کا نصف بہن کے لئے ہے۔''

اس طرح آیت میراث میں بار بار تَرَکَ (وہ چھوڑ مرے)، تَرَکْتُمْ (تم چھوڑ مرو)، تَرَکْنَ (وہ عورتیں چھوڑ مریں) کے الفاظ استعمال کئے گئے۔انہی آیات کی بناء پر وراثت کے لئے ترکہ کی اصطلاح نکلی ہے۔اور ترکہ اسی مال کو کہتے ہیں جو کوئی شخص چھوڑ کر مرجاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ انہی آیات میراث میں یہ بھی ہے کہ میت کا ترکہ اس کی وصیت پوری کرنے اور اس کا دَین ادا کرنے کے بعد تقسیم کیا جائے گا۔(۲۰)

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ(۲۱)

''یہ تقسیم ترکہ میت کی وصیت کی تکمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد اس کے ذمہ ہو،عمل میں آئے گی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مرتے ہی وارثوں کو اس کے مال پر قبضہ کرلینے کا حق نہیں ہے۔دین اور قرض کی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ میت کے مال میں سے انہیں کچھ نہ ملے۔انہی آیات میراث میں کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن سے واضح ہوتا

ہے کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اس کا وارث نہیں ہوتا۔ (۲۲)

" وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً اَوِامْرَاَۃٌ وَّلَہٗٓ اَخٌ اَوْاُخْتٌ فَلِکُلِّ وَّاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ " (۲۳)

''اور اگر میت ایک ایسا مرد یا عورت ہو جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا مگر اس کے بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔''

آیت میں لفظ کلالہ آیا ہے۔ ترجمے ہی سے معلوم ہو گیا ہے کہ کلالہ اس مرد یا عورت کو کہتے ہیں جس کی موت کے وقت نہ اس کا باپ زندہ ہو اور نہ کوئی اولاد زندہ ہو۔ احادیث کے ذخیرے میں بھی ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں کسی کی زندگی میں اس کی میراث کا کوئی سوال پیدا ہو بلکہ یہ نظر آئے گا کہ وارثت کہ سارے مسائل کسی کی موت کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں حقیقی معنی کے لحاظ سے وارثت اور میراث کے الفاظ اس مال و جائیداد کے لئے ہی بولے جاتے ہیں جو کوئی شخص اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ لفظ ترکہ کے مترادف ہیں۔ (۲۴)

ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس قبیلہ ازد کے ایک شخص کی میراث ہے۔ اور مجھے اب تک کوئی ازدی نہیں ملا کہ وہ میراث میں اس کے حوالے کر دیتا۔ (۲۵)

کتاب الفرض کی اس حدیث میں میراث کا لفظ ترکہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

☆ مورث کی وفات کے وقت زندہ رشتہ دار وراثت کے حقدار:

وارث کا دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ عورت کی وفات کے وقت جو رشتہ دار زندہ تھے صرف وہ اس وراثت سے مال لینے کے حقدار ہیں۔ اگر کوئی وارث مورث سے قبل وفات پا گیا تو وہ وارث وراثت سے کچھ نہ پائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ:

''بچہ جب پیدا ہونے کے بعد روئے (یعنی اس میں زندگی کی کوئی علامت پائی جائے) پھر مر جائے تب وارث ہوگا۔'' (۲۶)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی بچے کے وارث بننے کی شرط یہ ہے ماں کے پیٹ سے زندہ پیدا ہو۔ اگر مردہ پیدا ہوا تو وراثت سے محروم ہوگا۔ نبی ﷺ کا یہ فیصلہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی بچہ ماں کے پیٹ میں کسی کا وارث نہیں ہوتا۔ فرض کیجیے کسی کی بیوی حاملہ تھی بچہ ماں کے پیٹ کے اند زندہ موجود تھا۔ لیکن اس کے پیدا ہونے سے چند دن پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد جب وہ پیدا ہوا تو مردہ پیدا ہوا۔ نبی ﷺ کے فیصلے کے مطابق وہ بچہ اپنے باپ کی وراثت نہیں پائے گا۔ اس سے واضح ہوا کہ باپ کی وفات کے بعد اس سطح زمین پر وارث کا زندہ وجود (خواہ کتنے ہی مختصر عرصے کے لئے ہی

کیوں نہ ہو) ضروری ہے۔(۲۷)

☆ استحقاق وراثت کی بنیاد میت سے قریب ترین قرابت ہے:

اسلامی قانون وراثت کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ میت کہ مال میں حصہ پانے کی بنیاد اس سے قریب ترین قرابت ہے۔نہ محض قرابت اس کی بنیاد ہے۔اور نہ وارثوں کی ضرورت واحتیاج اس کی بنیاد ہے۔سورۃ النساء آیت ۷ میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ:

لِلرِّجَا لِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيب
مِّمَّاتَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوْضاً(۲۸)

''مردوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔اور عورت کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو تھوڑا ہو یا بہت۔یہ حصہ(اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔''

اس آیات میں صراحت ہے کہ مرد اور عورتیں اپنے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے ترکہ میں حصہ پائیں گے۔معلوم ہوا میت کے ترکے میں حصہ پانے کی بنیاد اس سے قریب ترین رشتہ ہے۔یہ بنیادی اصول بیان کرنے کے بعد اللہ تعالی نے آگے کی آیتوں میں قریب ترین رشتہ داروں کے حصے خود متعین کر دیئے ہیں۔(۲۹)

احادیث نبوی اسی بنیادی اصول کی تشریح کرتی ہیں۔

عن ابن عباس قال قال رسول ﷺ الحقوا الفرائض با هلها فما بقى لا ولى رجل ذكر (۳۰)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:''ذوی الفروض کو ان کے حصے دو پھر جو باقی رہ جائے وہ میت کے قریب ترین مرد رشتہ دار کا ہوگا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذوی الفروض کے حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ میت کے قریب ترین عصبہ کا ہوگا۔اس میں صرف مرد کی صراحت اس لئے ہے کہ اصلاً عصبہ مرد ہی ہوتا ہے۔عورت بذات خود عصبہ نہیں ہوتی۔(۳۱)

اسی طرح حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی ان کی دو بیٹیوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا کہ: یارسول اللہ ﷺ یہ سعد بن ربیع کی بچیاں ہیں ان دونوں کے والد آپ کے ساتھ غزوہ احد میں شریک تھے اور اس میں شہید ہو گئے۔ان دونوں کے چچا نے سعد کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور ان کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔اگر ان دونوں کے پاس کچھ نہ

ہوگا تو ان کی شادی کس طرح ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس بارے میں اللہ فیصلہ فرمائے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیات میراث نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان دونوں لڑکیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ ''سعد کی دونوں بیٹیوں کو دو ثلث مال دے دو اور ان دونوں کی ماں کو ثمن (آٹھواں) حصہ دو۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تمھارا ہے۔ (۳۲)

چونکہ ان لڑکیوں کے چچا سعد کے قریب ترین عصبہ تھے۔ کوئی دوسرا قریب ترین عصبہ موجود نہ تھا۔ اسی لئے اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد باقی مال انہی کو دیا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ

''سگے بھائی بہن وارث ہونگے ان کی موجودگی میں سوتیلے بھائی بہن وارث نہ ہوں گے۔'' (۳۳)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر میت کے ورثاء میں سگے بہن بھائیوں اور سوتیلے بھائی بہنوں کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو سگے بھائی بہن وارث ہونگے نہ کہ سوتیلے۔ اس لئے کہ میت کے قریب ترین عصبہ سگے بہن بھائی ہیں۔

یہ تین احادیث بھی اقربیت کے اصول کی توضیح کے لئے کافی ہیں۔ (۳۴)

☆ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر:

عصبہ میں تقسیم ترکہ کا اصولی ضابطہ قرآن نے (مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے) مقرر کیا ہے۔ میت کے عصبہ میں قریب ترین عصبہ اس کی اولاد ہے۔ اور آیات میراث میں سب سے پہلے اولاد ہی کی حصہ رسدی کا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔

مرد کا حصہ عصبہ میں صرف دو عورتوں کے برابر ہے۔ اس لئے کہ شریعت نے مرد پر اخراجات کی وہ بہت سی ذمہ داریاں عائد کردی ہیں جو عورتوں پر عائد نہیں کی ہیں۔ مرد پر اپنی بیوی کا مہر بھی واجب ہے اس کا نان نفقہ بھی واجب ہے، اپنے بچوں کی کفالت بھی واجب ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کے اخراجات و انتظامات بھی واجب ہیں۔ عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اس کو کسی کی وراثت میں کچھ مل رہا ہو تو اس کا حصہ عورتوں سے زیادہ ہونا چاہیے۔ (۳۵)

ورثاء کی قسمیں:

شریعت نے جن رشتہ داروں کو وارث ٹھہرایا ہے وہ تین قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

۱) ذوی الفروض ۲) عصبات ۳) ذوی الارحام

ا۔ذوی الفروض:

یہ وہ رشتہ دار ہیں جن کے حصے شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں اور جن کے متعلق قرآن مجید یا حدیث میں واضح احکام موجود ہیں۔ قرآن مجید میں یہ احکام سورۃ النساء میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۲۔عصبات:

یہ وہ رشتہ دار ہیں جن کو وارث تو ٹھہرایا گیا ہے لیکن ان کا کوئی حصہ قرآن واحادیث میں مقرر نہیں کیا گیا۔حکم یہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے عصبات میں تقسیم کرنا چاہیے۔اس کے متعلق کچھ احکام سورۃ النساء میں ہیں۔اور بخاری کی حدیث میں ہیں کہ:

الحقوا الفرائض باھلھافما بقی فھو لاولی رجل ذکر

یعنی ذوی الفروض سے جو بچ جائے ،وہ قریبی مرد رشتہ داروں کا ہے

۳۔ذوی الارحام:

یہ وہ ددھیالی اور ننھیالی رشتہ دار ہیں جو ذوی الفروض یا عصبہ نہ ہوں۔اور میت میں اور ان میں کسی عورت کے واسطے سے رشتہ ہو یا خود وہ عورت ہوں۔مثلاً: نانا،نواسا پھپھو، خالہ، ماموں وغیرہ۔ان کے متعلق ایک آیت سورۃ نساء کی اور ایک آیت سورۃ انفال کی اور بخاری کی ایک حدیث ہے۔

لِلرِّجَا لِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّاتَرَکَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ

والدین اور قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ دیں اس میں مردوں اور خواتین دونوں کا حصہ ہے'' (النساء)

اسی طرح سورۂ انفال کی آیت میں ہے کہ

وَاُولُوا الْاَرْحَا مِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ط (سورہ انفال ۷۵)

''اور بعض ذوی الارحام دوسروں کے مقابلے میں کتاب اللہ کی رو سے زیادہ مستحق ہیں۔''

بخاری کی حدیث ہے کہ

الخال وارث من لاوارث لهٗ ابن اخت القوم منهم

''جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث ماموں ہے اور بھانجا اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔''

ان کو تر کہ میں سے اس وقت حصہ ملتا ہے جب ذوی الفروض اور عصبات میں کوئی موجود نہ ہو یعنی زندہ نہ ہوں ۔ یا صرف بیوی اور شوہر ہوں اور ذوی الارحام ہوں ۔(۳۶)

مسئلہ ھذا کا تعلق:

مسئلہ ھذا یعنی پوتے کا تعلق رشتہ داروں کی اقسام میں سے عصبات سے ہے، اس لیے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ عصبات میں کس ترتیب سے مال تقسیم کیا جاتا ہے اور کون کس وقت عصبہ بنتا ہے ۔ ذیل میں عصبات کی اقسام اور ان کی وجود ترجیح ذکر ہے ۔

عصبہ کی قسمیں:

عصبہ کی دو قسمیں ہیں ۱۔عصبہ نسبی ۲۔عصبہ سببی

۱۔عصبہ نسبی: وہ عصبہ ہیں جن کا میت سے ولادت کا تعلق ہوتا ہے ۔

۲۔عصبہ سببی: وہ عصبہ ہیں جن کا میت سے عتاق کا تعلق ہوتا ہے ۔

یہاں صرف عصبہ نسبی کا مسئلہ سے تعلق ہے ۔ اس لیے صرف اسی کی اقسام کو زیرِ بحث لیا گیا ہے ۔

عصبہ نسبی کی اقسام:

عصبہ نسبی کی تین قسمیں ہیں ۔ ۱۔عصبہ بنفسہ ۲۔ عصبہ بغیرہ ۳۔عصبہ مع غیرہ

عصبہ بنفسہ: ہر اس مذکر رشتہ دار کو کہتے ہیں جس کا میت سے رشتہ جوڑنے میں مونث کا واسطہ نہ آئے ۔

اس تعریف کے رو سے وہ تمام رشتہ دار نکل گئے جو مونث کے واسطے سے میت کی طرف منسوب ہوتے ہیں مثلاً نواسہ، کہ لڑکی کے واسطے سے ہوتا ہے ۔ نانا (اب الام) کہ ماں کے واسطے سے ہوتا ہے ۔ اور جو رشتہ دار مذکر و مونث دونوں کے واسطے ہوتے ہیں ان میں مذکر کا ہی اعتبار ہوگا مونث کا نہیں ۔

عصبہ بنفسہ کی چار قسمیں ہیں ۔

۱۔جزءِ میت: یعنی میت کی نسل مذکر یا فروع مذکر چاہے نیچے کی ہوں جیسے لڑکے پھر پوتے (نیچے تک) ۔ اس کو رشتہ بنوت کہتے ہیں ۔

۲۔اصل میت: یعنی میت کے اصول مذکر چاہے اوپر کے ہوں جیسے باپ، پھر دادا (اوپر تک) ۔ اس کو رشتہ ابوت کہتے ہیں ۔

۳۔جزء اب میت: میت کے باپ کی نسل یعنی مذکر اولاد جیسے حقیقی بھائی پھر علاتی بھائی پھر حقیقی بھائی کے لڑکے پھر علاتی بھائی

کے لڑکے (اسی طرح نیچے تک)۔حقیقی علاتی پر مقدم رہیں گے۔اس کو رشتہ اخوت کہتے ہیں۔

۴۔جزء جدمیت: یعنی میت کے دادا کی مذکر نسل یعنی اولاد مذکر جیسے حقیقی چچا پھر علاتی چچا پھر حقیقی چچا کے لڑکے (اسی طرح نیچے تک)۔حقیقی ہمیشہ علاتی پر مقدم رہیں گے۔اس کو رشتہ عمومت کہتے ہیں۔(۳۷)

عصبہ بنفسہ کی وجوہ ترجیح:

عصبات کی تمام اقسام بیک وقت وارث نہیں ہوتیں بلکہ وجو ترجیح کے ذریعے ان میں چھانٹی کی جاتی ہے۔وجوہ ترجیح تین ہیں۔

ترجیح بالجہۃ: پہلی قسم کے ہوتے ہوئے بقیہ تین قسمیں عصبہ نہیں ہوتیں۔دوسری قسم کے ہوتے ہوئے بقیہ دو قسمیں محجوب ہوتی ہیں۔اسی طرح تیسری قسم کے ہوتے ہوئے چوتھی قسم محجوب ہوتی ہے۔

علی سبیل القہقری اس کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ چوتھی قسم تب وارث بنے گی۔جب پہلی قسمیں نہ ہوں۔تیسری قسم اس وقت وارثت کی حقدار ہوگی جب پہلی دو قسمیں نہ ہوں اور دوسری قسم اس وقت عصبہ بنے گی جب پہلی قسم نہ ہو۔

ترجیح بالقرب: اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد محجوب ہوتا ہے۔لہذا ابن کے ہوتے ہوئے ابن الابن آخرہ محجوب ہے۔ اب کے ہوتے ہوئے جد الیٰ آخرہ محجوب ہے۔اخ عینی وعلاتی کے ہوتے ہوئے ابن الاخ عینی وعلاتی الی آخرہ محجوب ہے۔

ترجیح بالقوۃ: قوی (قرابت والے) کے ہوتے ہوئے ضعیف (قرابت والا) محجوب ہے۔چنانچہ اخ عینی کی موجودگی میں اخ علاتی اور ابن الاخ عینی کے ہوتے ہوئے ابن الاخ علاتی محجوب ہے۔عم عینی کے ہوتے ہوئے عم علاتی اور ابن العم عینی کے ہوتے ہوئے ابن العم علاتی محجوب ہے۔(۳۸)

دفعہ نمبر ''۴'' پوتے کی میراث کا تجزیہ:

مندرجہ بالا میراث کی تفصیلات کو مدنظر رکھ کر اس دفعہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ اس قانون میں مندرجہ ذیل شرعی دلائل کی کھلی مخالفت کی گئی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں اس مضمون کا ایک مستقل باب رکھا ہے۔**باب میراث الابن اذالم یکن ابن** اور اس میں حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ **ولا یرث ولد الابن مع الابن** '' بیٹوں کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوسکتا۔''

یہ زید بن ثابتؓ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہر جمعہ کے خطبہ میں موجود ہے۔

وافرضهم زيد بن ثابت رضی اللہ عنہ

''صحابہ رضی اللہ عنہم میں فرائض (علم میراث) کے سب سے بڑے عالم زید بن حارث رضی اللہ عنہ ہیں۔''

۲۔ علامہ عینیؒ اور علامہ ابوبکر حصاص رازیؒ نے اس پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔(۳۹) صحابہ کرام اور تمام علماء امت کا اجماع اتنی مضبوط دلیل ہے کم ازکم کسی مسلمان کو اس کے خلاف کہنے کی جراءت نہیں ہوسکتی۔

۳۔ قرآن کریم میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

لِلرِّجَا لِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّاتَرَكَ الْوَا لِدٰ نِ وَالْاَقْرَبُوْنَ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وارثت کے دو بنیادی اصول بیان فرمادیئے ہیں۔ایک یہ کہ وارثت کی تقسیم فقر وافلاس اور حاجت مندی کے معیار پر نہیں بلکہ قرابت اور رشتہ داری کے معیار پر ہے۔یعنی تقسیم وراثت کے وقت یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون زیادہ مفلس یا حاجت مند ہے؟ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ مرنے والے سے کون قریبی رشتہ رکھتا ہے؟

دوسرے یہ کہ جہاں تک نفس قرابت کا تعلق ہے وہ تو تمام آدمؑ کے بیٹوں میں مشترک ہے۔اس لیے یہ اصول بتلایا کہ قرابت میں بھی اقربون کا اعتبار کیا جائے گا اور اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو محروم کیا جائے گا۔

زیر بحث مسئلہ میں میت کا قریبی رشتہ دار یعنی صلبی بیٹا موجود ہے۔لہذا مذکوہ بالا اصول سے بعید رشتہ دار یعنی پوتا محروم ہوگا۔

۴۔ قرآن کریم مورث کے ترکے میں صرف ان رشتہ داروں کو میراث دلواتا ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں لیکن آرڈی نینس کی یہ دفعہ بعض ان رشتہ داروں کو حصہ دلاتی ہے۔جو مورث کی زندگی میں وفات پا چکے ہیں (یعنی میت کا بیٹا یا بیٹی)۔(۴۰)

۵۔ اس آرڈی نینس کے تحت صرف یتیم پوتے کو وارثت میں سے حصہ دیا جارہا ہے۔تو باقی پوتوں کو بھی دیا جانا چاہیئے اور اگر باقی کو نہیں دیا جارہا تو یتیم کو بھی نہیں دیا جاسکتا۔

یتیم پوتے کو دادا کی میراث میں حصہ کس اصول کے تحت دیا جائے گا ؟؟

قرآن اور احادیث سے ثابت شدہ ان مسلمہ اصولوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے کہ دادا کی اپنی اولاد کی موجودگی میں یتیم پوتے کو کس اصول کے تحت دادا کے ترکہ میں حصہ مل سکتا ہے؟ پہلے اصول کے تحت جب یتیم پوتے کا باپ ہی وارث نہ ہوسکا تو یتیم پوتا سگے چچا کی موجودگی میں اپنے دادا کا وارث کس طرح ہوگا۔

تیسرے اور چوتھے اصول کے تحت بھی پوتا کو حصہ نہیں مل سکتا کیو ں کہ قریب ترین عصبہ موجود ہیں اور قریب ترین عصبہ کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کو وارثت نہیں مل سکتی۔(۴۱)

یتیم پوتے کو میراث دینے کی وجہ:

اس آرڈی نینس کے حامی افراد جو یتیم پوتے کو میراث دلوانا چاہتے ہیں اس کی وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ یتیم بے بس اور بے کس ہے۔اس کی کفالت کون کرے گا اور اس کی ضروریات کون پورا کرے گا؟ اس مسئلہ کا ایسا حل قرآن وسنت کی روشنی میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ یتیم کی کفالت کا انتظام ہو جائے نہ کہ اللہ کی حدود(متعین کردہ حصوں) کو چھیڑا جائے۔اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یتیم کی کفالت کا کوئی انتظام اسلامی شریعت نے کیا ہے؟ یا نہیں؟ سید احمد عروج اپنی کتاب ''اسلام کے عائلی قوانین'' میں یتیم کی کفالت کے شرعی انتظامات کے متعلق تفصیل سے لکھتے ہیں کہ

یتیم کی کفالت کے شرعی انتظامات؛

اسلام نے یتیم پوتے کی کفالت کے لیے وراثت کی بے اصول اور الل ٹپ تقسیم کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اس نے اپنے متوازن اور معتدل اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے انتظامات کئے ہیں۔

ا۔ یتیم کی کفالت اس کے قریب ترین رشتہ داروں پر واجب:

اسلامی شریعت نے یتیم کی کفالت کے لیے سب سے پہلے اس کے قریبی رشتہ داروں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔مثلاً زیر بحث مسئلہ کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ یتیم پوتے کے جو چچا اسلامی قانونِ وراثت کے تحت اپنے باپ کی میراث پا رہے ہیں۔وہی اپنے یتیم بھتیجے کے ولی ہوں گے اگر وہ محتاج اور ضرورت مند ہو تو اس کی کفالت ان پر واجب ہے۔اگر وہ کسی اور ذریعے سے صاحب جائیداد اور مالدار ہوں تو اس کی جائیداد اور مال کی حفاظت اور اس بچے کے کھانے پینے اور اسکی تعلیم اور تربیت کا انتظام ان پر واجب ہوگا۔

اسلام نے کسی بھی یتیم بچے کو بے کس و بے بس نہیں چھوڑا ہے بلکہ سب سے پہلے اس کے قریبی رشتہ داروں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اگر قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ داروں کو کفالت کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اگر شاذ و نادر یہ صورت پیش آئے کہ اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہیں یا خود مفلس ہو تو پھر مسلمانوں کا بیت مال اس بچہ کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا۔

دلیل : فقہائے امت نے اس حکم کے لیے قرآن وحدیث سے استدلال کیا ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ط وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ج لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (البقرۃ ۲۳۳)

''اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لیے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں اور بچہ والے کے ذمہ بچوں کی ماں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے اور کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور نہ کسی کی ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے، اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے''۔

اس آیت میں اس صورت حال کا حکم ہے جب کسی شیر خوار بچے کی ماں سے اس کے باپ کا تعلق منقطع ہو چکا ہو اس صورت میں باپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شیر خوار بچے کے دودھ پلوانے کے اخراجات برداشت کرے اور اگر بچے کے باپ کی وفات ہو جائے تو یہی ذمہ داری اس بچے کے ہونے والے وارث پر عائد ہو گی اس آیت کا ٹکڑا یہ ہے ''وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ'' (اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے)

امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، قتادۃ اور ابن ابی لیلیٰؒ نے کہا ہے کہ اس آیت میں وارث سے مراد ہر وہ شخص ہے خواہ وہ عورت یا مرد، جو اس بچے کی وفات کے بعد اس کی وراثت پانے کی اہلیت واستحقاق رکھتا ہو۔ ان سب ہونے والے وارثوں پر اس بچے کی کفالت کرنا واجب ہے۔ اور انہیں اس کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ ان آئمہ نے کئی حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ نسائی میں طارق کی حدیث ہے کہ میں مدینے میں اس وقت پہنچا جب رسول کریم ﷺ منبر پر لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ دینے والا ہاتھ بلند ہوتا ہے تم ان لوگوں پر خرچ کرو جن کی کفالت تم کر رہے ہو۔ اپنے ماں باپ پر خرچ کرو، بہن بھائی پر خرچ کرو پھر اس کے بعد ہر قریب تر رشتہ دار پر خرچ کرو۔

۲۔ امام احمد، ابوداؤد، امام ترمذی نے معاویہ بن حیرہ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میں کس کے حق ادا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! ''اپنی ماں کے حقوق''۔ میں نے پھر پوچھا کس کے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنی ماں کے حقوق۔'' میں نے پھر پوچھا کس کے ادا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے باپ کے حقوق ادا کرو۔ پھر جو

تم سے قریب تر رشتہ رکھتا ہو اس کے ادا کرو۔''

۳۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! ''اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ اپنی اہل قرابت پر خرچ کرو۔''

ان حدیثوں کی وجہ سے امام احمد وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وارث بچے کا محرم ہو یا نہ ہو اور اس کا عصبہ ہو یا نہ ہو اس پر بچے کی اخراجات واجب ہوں گے۔امام ابوحنیفہ ؒ کا قول بھی یہی ہے مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ بچے کی کفالت اس رشتہ دار پر واجب ہے جو اس کا محرم بھی ہو۔ایک قول یہ ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وہ رشتہ دار ہیں جو اس کے عصبہ ہوں لہذا بچے کے عصبات اس کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور کئے جائیں گے،مثلاً دادا، چچا، بھتیجا، چچازاد بھائی۔

امام بغوی نے کہا ہے کہ یہ عمر بن خطاب کا قول ہے اور اسی کو ابراہیم نخعی، مجاہد، عطا اور سفیان نے اختیار کیا ہے۔

یتیم پوتے کی کفالت کا یہ ہے وہ پہلا انتظام جو اسلامی شریعت نے کیا ہے۔اگر یتیم پوتے کو ہر حال میں دادا کی وراثت دلوانے کی کوشش کرنے والے حضرات یہ کہیں کہ اس پر مسلمانوں کا معاشرہ عمل نہیں کر رہا ہے اور اس کی بھی کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پر انہیں مجبور کیا جائے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی قوانین وراثت میں خلل ڈالنے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمان یتیم کی کفالت کے حکم پر عمل کرنے لگ جائیں اور مسلم پرنسل لاء میں جو دفعہ وراثت سے متعلق ہے اس میں یہ اضافہ کیا جائے کہ اگر کسی شخص کا محتاج اور ضرورت مند یتیم پوتا موجود ہو تو اس ترکہ پانے والی اولاد اس یتیم پوتے کی کفالت کی ذمہ دار ہوگی۔

۲۔ وصیت کا قانون:

محتاج اور ضرورت مند یتیم پوتوں، بلکہ تمام ایسے رشتہ داروں کی کفالت اور ان کی مالی امداد کے لیے، جو میت کے ترکے سے حصہ نہ پا رہے ہوں۔اسلامی شریعت میں وصیت کا قانون موجود ہے۔مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں، جبکہ آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی۔عبوری دور کے لیے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے لیے اپنے مال میں وصیت کر کے اس دنیا سے رخصت ہوں۔فرمایا گیا ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ
نِ لْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ. ط

''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا تو تم پر فرض کیا گیا ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔''

یہ حکم ورثاء کے حصے مقرر کرنے سے پہلے کا تھا پھر جب سورہ نساء میں آیت میراث نازل ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی میت کے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے حصے مقرر کر دیئے تو وارثوں کے حق میں عبوری دور کی وصیت منسوخ ہوگئی۔ اب ورثاء کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی لیکن ترکہ نہ پانے والوں کے حق میں یا دوسرے امور خیر کے لیے وصیت منسوخ نہیں کی گئی جیسے کہ آیت میراث میں کئی جگہ کہا گیا کہ میت کا ترکہ اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد تقسیم کیا جائے گا۔ مورث اپنے کتنے مال کی وصیت کر سکتا ہے اس کی مقدار رسول اکرم ﷺ نے تہائی مال کی ہے۔ کوئی مسلمان اپنے ثلث (تہائی) مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا اس پر تمام آئمہ دین کا بھی اتفاق ہے کہ غیر وارث قرابت مندوں کے لیے تہائی مال میں وصیت کرنا جائز اور بعض حالات میں مستحب ہے۔ جبکہ بعض صحابہ کرامؓ اور متعدد فقہاءِ علماء سے منقول ہے کہ وہ تہائی مال میں وصیت کو واجب کہتے ہیں۔

اس مختصر تفصیل سے بھی معلوم ہوا کہ وصیت کے اس قانون سے ہر اس رشتہ دار کی مالی مدد کی جاسکتی ہے جو میت کے ترکے میں حصہ نہ پا رہا ہو خواہ وہ میت کا یتیم پوتا ہو یا پوتی، نواسہ ہو یا نواسی یا کوئی اور رشتہ دار۔

اگر مسلمانوں نے وصیت کے اس حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی گنجائش بھی موجود ہے کہ قانون وراثت کی دفعہ میں چند ایسی شقیں بڑھائی جائیں جن کا بناء پر وراثت نہ پانے والے ضرورت مند رشتہ داروں کو میت کے تہائی مال میں سے مناسب حصہ مل سکے۔ میں ہر جگہ ضرورت مند اور محتاج کی قید اس لیے بڑھا رہا ہوں کہ میت کے مال میں غیر وارثوں کو لازماً ہر حال میں حصہ دار بنا کر اسلامی قانون وراثت کو توڑنا اور اس کے مسلم اصولوں میں خلل ڈالنا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر غیر وارث رشتہ دار محتاج ہوں تو میت کے مال سے ان کی بھی مدد کی جاسکے۔

۳۔ غرباء رشتہ داروں کو تقسیم میراث کے وقت حصہ دینے کی ہدایت:

وصیت کا تعلق تو مورث سے ہے جبکہ قرآن میں وارثوں کو ایک ہدایت یہ دی گئی ہے کہ مورث کی جائز وصیت پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہ کریں۔ دوسری طرف انھیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ خاندان کے ان رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں کو بھی جو شرعاً میت کی وراثت نہ پا رہے ہوں، میت کے ترکہ میں سے کچھ دے دیں۔ آیت میراث

سے کچھ ہی پہلے یہ آیت ہے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (النساء:۸)

''اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو اور شیریں کلامی سے پیش آیا کرو۔''

اگر چہ جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ آیت میراث نازل ہونے کے بعد اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا لیکن حضرت ابن عباس، شعبی نخعی، زہری، مجاہد، قتادہ اور فقہا کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہوا ہے حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول امام بخاری نے بھی اس آیت کے تحت اپنی صحیح میں سندا روایت کیا ہے۔

یہ ہدایت بھی درحقیقت غیر وارث یتیم و مسکین رشتہ داروں کی مالی امداد کا ایک انتظام ہے۔ ہم اس آیت کے حکم کو واجب کہیں یا مستحب، بہرحال یہ ایک ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے میت کی وراثت پانے والوں کو دی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے بیت المال کی ذمہ داری:

یتیموں کی کفالت آخری انتظام یہ ہے کہ اگر کسی یتیم کا کوئی ایسا رشتہ دار موجود نہ ہو جس پر شرعاً اس کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو تو اسلامی حکومت اس کی کفیل ہوگی اور مسلمانوں کے بیت المال سے اس کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔

بیت المال میں زکوۃ کا جو مال ہوتا ہے نادار یتیم اس کے مستحق تو ہیں ہی، اس کے علاوہ خمس میں صراحت کے ساتھ ان کا حصہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (سورۃ انفال:۴۱)

''اور جان رکھو مال غنیمت جو کچھ ہے اس میں پانچواں حصہ اللہ اور رسول کا، اہل قرابت کا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔''

اس کے علاوہ احادیث بھی اس کی تائید میں ملتی ہیں۔

☆ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ''جس نے کوئی قرض چھوڑا ہو جو اس کے مال سے ادا نہ کیا جا سکتا ہو یا نادار بچے چھوڑے ہوں، تو ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔''

دوسری روایت میں ہے کہ ''جس نے مال چھوڑا ہو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جس نے محتاج ذریت چھوڑی ہو تو ان کی ذمہ

داری مجھ پر ہے۔'' (۴۲)

حرف آخر:

احکام وراثت ان احکام میں سے ہیں جن کی بجا آوری کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ نیز احکام وراثت وہ واحد موضوع ہے جس کی تفصیلات اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں بیان فرمادیں۔ اور حصہ مقرر کردینے کے بعد اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً فرماتے ہیں۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْماً حَكِيْماً (النساء:۱۱)

اسی طرح اگلی آیت میں فرمایا

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (النساء:۱۲)

یہ اللہ کے فرض کردہ احکامات ہیں ان پر عمل کرنے کی اللہ کی طرف سے وصیت ہے۔ اب اگر ہم اپنے عقل کے گھوڑے دوڑا کر ان احکامات میں ردوبدل کے مرتکب ہوتے ہیں تو اگلی ہی آیات میں اللہ نے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے والوں کے انجام سے بھی آگاہ فرمادیا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ ا لْعَظِيْم وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِداً فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (سورۃ النساء:۱۲)

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کریں گے۔ اللہ انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ عظیم کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے آگے بڑھے گا اللہ اسے ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور رسوا کن عذاب میں مبتلا ہوگا۔''

یہ بشارت اور یہ وعید کافی ہے اس بات کے لئے کہ ہم اللہ کے قانون میراث کو من وعن مان لیں اور یتیم پوتے کی مدد کے لئے کفالت کے دیگر انتظامات کو قابل عمل بنائیں نہ کہ اللہ کی حدود میں تبدیلی کی جائے۔

مراجع وحواشی:

۱۔ میاں انعام الحق، محمڈن لاء، ص ۶۴، لاہور، منصور بک ہاؤس انارکلی
۲۔ قاضی، شمس الحق وعبدالحمید، مسلم عائلی قوانین شرح، ص ۶، لاہور، ایسٹرن لاء بک ہاؤس، ۲۰۱۵
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً
۸۔ ایضاً
۹۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۱، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشر، جنوری ۲۰۱۵
۱۰۔ اصغر حسین، مفید الوارثین، ص ۱۰، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۰ء
۱۱۔ خاصخیلی، مفتی محمد فاروق، الشرح الناجی فی حل السراجی صفحہ ۲۲ کراچی، مکتبہ برکات المدینہ، اکتوبر ۲۰۰۸
۱۲۔ الدر المختار مع رد المختار، کتاب الفرائض ۶/ ۷۵۸، دار الفکر، بیروت
۱۳۔ مستدرک للحاکم، رقم الحدیث ۸۰۶۷
۱۴۔ ایضاً، رقم الحدیث ۸۰۷۰
۱۵۔ السنن الکبری للبیھقی، کتاب الفرائض، باب الحث علی تعلیم الفرائض، رقم ۱۳۱۷۷، ۶/۳۴۴، دار الکتب العلمیہ
۱۶۔ المیراث فی المذاھب الاربعۃ، مقدمہ المیراث، الفصل الاول، ص ۹، دار الفکر، بیروت
۱۷۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۳
۱۸۔ سورۃ النساء آیت ۷
۱۹۔ سورۃ النساء آیت ۱۷۶
۲۰۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین ص ۲۳۴

۲۱۔ سورۃ النساء آیت ۱۱
۲۲۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین ص ۲۳۵
۲۳۔ سورۃ النساء آیت ۱۲
۲۴۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین ص ۲۳۵
۲۵۔ بوداؤد، کتاب الفرائض
۲۶۔ ابوداؤد، کتاب الفرائض
۲۷۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۵
۲۸۔ سورۃ النساء آیت ۷
۲۹۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۶
۳۰۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم
۳۱۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۷
۳۲۔ جامع ترمذی
۳۳۔ ایضاً
۳۴۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۳۷
۳۵۔ ایضاً ص ۲۳۸
۳۶۔ سید شوکت علی، تقسیم میراث، ص ۱۷، لاہور، اسلامک پبلیکشنز، ۱۹۹۱
۳۷۔ دربھنگوی، اشتیاق احمد، طرازی شرح سراجی، ص ۱۰۴، کراچی، مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۰۹
۳۸۔ ابولبابہ شاہ منصور، تسہیل السراجی، ص ۵۱، پاکستان، ۲۰۰۹
۳۹۔ عمدۃ القاری، ص ۲۳۸، ج ۲۳، احکام القرآن، ص ۱۰۱، ج ۲
۴۰۔ عثمانی، محمد تقی، ہمارے عائلی مسائل، ص ۲۷، کراچی، دارلاشاعت
۴۱۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین ص ۲۳۸
۴۲۔ ایضاً، ص ۲۴۱

امریکہ ویورپ میں ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی
کی علمی و تحقیقی خدمات کا جائزہ

عابدہ سلطانہ *

دورِ جدید میں جن مسلمان دانشوروں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں مقیم مسلمانوں کی فکری اور ذہنی رہنمائی کی اور عالمی تحریک اسلامی کو دوام بخشا ان میں اتحاد عالم اسلامی کے داعی، ممتاز دانشور، فقہ، تاریخ اور مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ و تجزیہ کے ماہر ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ ۱۹۲۱ء میں فلسطین کے ایک شہر جافا (JAFA) کے ایک بااثر متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے روایتی دینی مدارس سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم رملہ سے جبکہ اعلیٰ تعلیم امریکن یونیورسٹی بیروت سے حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں وطن واپس آئے۔ اس کے بعد آپ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کے الفاظ میں:

> ''امریکن یونیورسٹی بیروت سے گریجویشن کرنے کے بعد میں عرب کو آپریٹو سوسائٹیز میں رجسٹرار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ پھر ایڈمنسٹریٹو آفیسر اور اس کے بعد گلیلی کا گورنر بنا دیا گیا۔ جب جیش انفقاء (امدادی فوج Rescue Army) تشکیل دی گئی میں شمالی علاقوں میں فوج کے زیرِ نگرانی اس وقت تک ایڈمنسٹریٹو گورنر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا رہا۔ جب تک وہ علاقہ مکمل دشمن کے قبضہ میں نہیں چلا گیا۔'' (۱)

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی نام نہاد ریاست وجود میں آتے ہی آپ کے خاندان کے تمام افراد کو صیہونی حکمرانوں نے زبردستی

---

* ڈاکٹر مدیرہ مجلۃ المحصنات

اردن بھیج دیا۔ اردن آ کر کچھ عرصہ آپ پتھروں کی ٹھیکیداری کرتے رہے، کیونکہ آپ کا طبعی میلان ٹھیکیداری کی طرف نہیں تھا اس لیے سب کچھ چھوڑ کر ۱۹۴۹ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں آپ نے فلسفے میں ایم۔اے کیا اور مزید تعلیم کے لیے انڈیانا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۲ء میں ''کانٹ'' کے فلسفہ پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ جن دنوں آپ کانٹ کے فلسفہ پر کام کر رہے تھے انہی دنوں آپ پر مغربی فلسفہ کی حیثیت آشکار ہوئی اور تب آپ کے نظریات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی اور آپ نے ایک مسلم قوم پرست کا روپ دھار لیا۔ اس وقت قوم پرستی سے آپ کو جنون کی حد تک عشق تھا۔ آپ عرب نیشنلزم اور جمال عبدالناصر کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ عرب نیشنلزم کو آپ عالمِ اسلام کی ایک بنیادی ضرورت قرار دیتے تھے۔ نیشنلسٹ ہونے کے باوجود آپ کو قلبی اطمینان اور سکون نہیں تھا۔ آپ کے الفاظ میں:

> ''مغربی فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا احساس ہوا اور اسلامی تعلیمات سے دوری کا پتہ چلا پس میں پیچھے کی طرف پلٹا اور جامعہ الازہر میں داخلہ لے کر از سرِ نو علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اب کی دفعہ میں زیادہ انہاک اور توجہ سے کام میں جٹ گیا۔ جیسا کہ تین سال کے اندر کوئی نئی ڈگری لینا ہو۔''(۲)

۱۹۵۹ء میں آپ فل برائٹ اسکالرشپ پر میکگل یونیورسٹی کینیڈا چلے گئے وہاں آپ نے (Judaed-Christianity) پر تحقیقی کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں علم حاصل کرنے کی لگن آپ کو دوبارہ جامعہ الازہر لے آئی۔ اسی سال آپ نے دوسری بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جامعہ الازہر میں دوسری بار تعلیم کے دوران آپ عرب قومیت کے حصار سے نکل کر اسلامی نظریات کی طرف پلٹے۔ اس زمانے میں آپ کا تعارف بعض اخوانیوں سے ہوا جنہوں نے آپ کی سمت تبدیل کرنے میں کافی مدد کی۔ انہی اخوانیوں کی بدولت آپ کو حسن البناء شہید، سیّد قطب شہید اور مولانا مودودیؒ کی کتب کے مطالعہ کا موقع ملا۔
مولانا کی کتب کے مطالعہ کے بعد آپ کی رائے تھی کہ:

''ان کی فکر ایک صدی آگے کی فکر ہے۔''

۱۹۶۱ء میں آپ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور سینٹرل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کراچی سے وابستہ ہو گئے۔

۱۹۶۲ء میں آپ پاکستان سے سائیراکوس یونیورسٹی کے شعبہ مذاہب سے وابستہ ہوگئے بعدازاں صدر شعبہ بنائے گئے۔ یہاں آ کر آپ کی سرگرمیاں زیادہ تر تربیتی نوعیت کی تھیں۔ آپ ایک طرف طلبہ کی تحقیقی ضروریات میں ان کی رہنمائی کرتے دوسری طرف ان کی دینی تربیت بھی۔ انہی دنوں آپ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مسلمان طلبہ کی سب سے بڑی اور منظّم تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A) میں شامل ہوئے۔

آپ کے الفاظ میں:

> ''امریکہ میں تحریکِ اسلامی میں میرے رجحان نے میری نگاہ میں وسعت اور گہرائی پیدا کی یہ کہ میں امریکہ میں اسلام کے احیاء اور نشو ونما کے لیے کام کروں۔ چنانچہ میں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی سرگرمیوں میں تربیت کے علاوہ اسلامی فکر میں گہرائی بھی پیدا کی۔''(۳)

یونیورسٹی میں قیام کے دوران مستقبل کی منصوبہ بندی کے علاوہ چھ برس تک مسلسل آپ اپنے پروگرام کو چلانے کے لیے مناسب افراد کی تلاش میں رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کا رابطہ دنیا بھر کے مسلمان دانشوروں اور اسکالروں سے بھی رہا۔ انہی دنوں (۱۹۶۷ء) بیت المقدس پر صیہونیوں کے قبضہ کا سانحہ فاجعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے آپ کی راتوں کی نیند اُڑا دی۔ چنانچہ مسلسل غور و فکر کے بعد آپ نے اپنے کام کو مزید تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سائیرکوس یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر آپ فلاڈلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی کے شعبہ مذاہب سے وابستہ ہو گئے اور پھر اپنی شہادت تک یہیں رہے۔(۴)

شہادت کے وقت مختلف ممالک کے ۳۵ طالب علم آپ کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے۔ ٹمپل یونیورسٹی مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا گڑھ تھا، اس کے علاوہ آپ پنسلوانیا اسٹیٹ یونیورسٹی اور پنسلوانیا یونیورسٹی میں جو کہ ٹمپل یونیورسٹی سے تین سو بیس کلومیٹر

کے فاصلے پر تھیں، جمعہ کے روز نماز کے وقت چلے جاتے اور طلبہ سے ملاقاتیں کرتے، چنانچہ آپ کی کوششوں سے ''اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن''، ''ایسوسی ایشن آف مسلم سائنٹسٹ اینڈ انجینئرز'' قائم ہوئیں۔ یہ دونوں انجمنیں اب مضبوط بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔ آپ مسلم ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں کے ایڈوائزر بھی تھے۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کی سرگرمیوں کا رُخ تبلیغی سے زیادہ علمی ہوگیا۔ آپ کی خواہش تھی کہ اسلام کی علمی اور فکری شناخت بحال کرنے کے لیے تحقیقی کام کیا جائے آپ اکثر کہا کرتے تھے:

''دنیا پر نہ یہودی کی حکومت ہے، نہ عیسائی کی، نہ روس کی، نہ امریکہ کی اس پر ہمیشہ علم کی حکمرانی رہی ہے. جو قوم یا نسل علم کے میدان میں آگے بڑھ جاتی ہے وہی دنیا کی امامت اور قیادت سنبھال لیتی ہے۔ مسلمانوں کے پاس علوم کا سرمایہ آیا تو وہ دنیا کے حکمران بن گئے۔ یورپ میں احیاء العلوم کی تحریک چل نکلی تو عیسائی دنیا غالب ہوگئی۔ یہودیوں نے اس میدان میں پیش رفت کی تو جرمنی، فرانس، برطانیہ، کینیڈا اور روس وغیرہ میں وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود غالب قوت بن گئے۔ جاپان نے اس کے ذریعہ اپنا لوہا منوایا اور آئندہ جو بھی علم میں آگے بڑھے گا وہی مستقبل کا فرماں روا ہوگا۔'' (۵)

فلاڈلفیا میں قیام کے دوران جس علمی اور تحقیقی کام کی منصوبہ بندی آپ نے کی تھی، عملی شکل دینے کا موقعہ ۱۹۸۰ء میں اس وقت ملا جب سوئٹزر لینڈ کے ایک شہر لوگانو (Lugano) میں دنیا بھر کی چالیس ممتاز علمی شخصیتیں اِکٹھی ہوئیں اور ایک طویل تھکا دینے والے اجلاس کے بعد ایک علمی ادارے کے قیام کی منصوبہ بندی کی گئی۔ چنانچہ اگلے سال ورجینا میں ایک مکمل خود مختار علمی ادارے اور عالمی ادارہ افکار اسلامی (International Institute of Islamic thought) کی بنیاد رکھی گئی۔ ادارے کا دائرہ عمل کسی ایک ملک تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ مسلم دنیا تک اس کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ ادارے کے قیام کا مقصد علمی بنیادوں پر اسلام کی شناخت کرانا تھا۔ چنانچہ دنیا بھر کے مسلمان اسکالرز اور دانشور ادارے کے مرکز میں آکر

مذاکرات اور مطالعے کے ذریعے اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔اس ادارے میں اقتصادیات،نفسیات،عمرانیات اور سیاسیات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے یہ ادارہ ہر سال ایک سمپوزیم منعقد کراتا ہے۔اس ادارے کے تحت ۱۹۸۴ء میں ملائیشیا میں ایک علمی کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔یہ ادارہ ڈاکٹر راجی الفاروقی کی عظیم یادگار اور ورثہ ہے۔اپنی شہادت سے پہلے آپ ''اسلامائزیشن آف نالج''پر کام کر رہے تھے۔اسلامائزیشن آف نالج پر ڈاکٹر فاروقی سے پہلے محمد عبدہ اور سیّد احمد خان وغیرہ دانشور اگرچہ کام کر چکے تھے لیکن بوجوہ اس کے مثبت نتائج نہ نکل سکے۔شیخ عبداللہ النصیف اور صالح ججوم نے ڈاکٹر راجی الفاروقی کی شہادت سے قبل کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک عالمی تعلیمی کانفرنس منعقد کی تھی۔اس کانفرنس میں راجی الفاروقی اور بو سلیمان نے واضح انداز میں اسلامائزیشن آف نالج کا نظریہ پیش کیا تھا۔اسلامائزیشن آف نالج کو عملی شکل دینے کے لیے جو بارہ نکاتی ورکنگ پلان آپ نے تیار کیا وہ کچھ یوں تھا:

- جدید علوم پر دسترس۔
- نظم تعلیم و تربیت کا جائزہ۔
- اسلامی علوم و فنون کے ورثے کی تدوین۔
- اسلامی ورثے کا تجزیہ۔
- اسلامی علوم کا تہذیب و تمدن سے رشتہ۔
- جدید تعلیم و تربیت کا تنقیدی جائزہ۔
- اسلامی ورثے اور علوم و فنون کا تنقیدی جائزہ۔
- اسلامی امہ کے اہم مسائل کی نشاندہی۔
- بنی نوع انسان کے مسائل کا جائزہ۔
- علوم کا تحقیقی تجزیہ اور اسے مختص کرنا۔

❁ جدید علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا۔

❁ اسلامی علوم کی شناخت۔(٦)

اس ورکنگ پلان کا مقصد ''عالمی ادارہ افکار اسلامی'' کے کام کو ٹھوس اور مثبت بنیادوں پر آگے بڑھانا تھا اور اس کے ذریعہ عالم اسلام کو ایک ایسی قیادت فراہم کرنا تھا جو حقیقی معنوں میں اسلامی امہ کے مسائل پر مکمل گرفت رکھنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ بدقسمتی سے اس منصوبے نے ٹمپل یونیورسٹی میں آپ کے کئی ایک حاسد پیدا کر دیے جو آپ کی حرکات و سکنات کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ٹمپل یونیورسٹی کے یہودی اساتذہ پیش پیش تھے۔ اکثر ٹیلی فون پر آپ کو دھمکیاں دی جاتیں۔ پہلے آپ کے بیٹے کو جو امریکن آرمی میں ملازمت کرتا تھا نہایت پراسرار طریقہ سے قتل کیا گیا اور آپ کو ایک عرصہ تک اطلاع نہیں دی گئی اور پھر اچانک ۲۷ مئی ۱۹۸٦ء کی صبح دو بج کر پینتیس منٹ پر ایک مسلح کمانڈو نے آپ اور آپ کی اہلیہ کو شہید اور بیٹی کو زخمی کر دیا۔ قاتل جوزف ینگ وقوعہ کے آٹھ ماہ بعد گرفتار ہوا۔ بارہ افراد کی جیوری نے اکتالیس سالہ جوزف کو دو افراد کے قتل کا مجرم ٹھہرایا اور سزائے موت سنائی۔ فلاڈلفیا کی تاریخ میں بیس سال کے بعد کسی مجرم کو سزائے موت دی گئی۔ مجرم جوزف ینگ نے عدالت میں اقرار جرم کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''میں رات گیارہ بجے سیاہ لباس پہن کر اور ایک لمبے پھل والا چاقو لے کر ڈاکٹر فاروقی کے گھر میں داخل ہوا۔ گھر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں صرف باورچی خانہ کی کھڑکی کھلی تھی۔ جب میں اِدھر اُدھر گھر کا نقشہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے پیاس لگی میں نے فریج کھولا اس میں چیری (پھل) پڑی تھیں میں نے انہیں کھا کر اس کی گھٹلیاں فرش پر پھینک دیں (یہ گٹھلیاں پولیس کو وقوعہ سے ملی تھیں) میں تقریباً دو گھنٹے تک انتظار کرتا رہا کہ اہل خانہ جاگیں۔ میں جانتا تھا کہ ان کو سحری کھانے کے لیے پو پھٹنے سے پہلے اُٹھنا ہے اور میری کاروائی کا وہی مناسب وقت ہے۔ دو بجے شب مسز فاروقی اُٹھیں وہ جونہی باورچی خانے میں آئیں تو میں نے ان

کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دیوار کے ساتھ دھکیل دیا اور چاقو سے ان پر پے در پے وار کرنے لگا۔ مسز فاروقی کی چیخیں سن کر ان کی بیٹی آ گئی تو میں نے اسے بھی زخمی کر دیا اتنی دیر میں ڈاکٹر فاروقی آ گئے وہ جلدی سے ٹیلی فون کی میز کی طرف بڑھے انہوں نے ابھی ٹیلی فون پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میں نے ان پر چاقو سے وار کر دیا وہ میری مزاحمت کرتے رہے لیکن میں چاقو سے وار کرتا رہا یہاں تک کہ وہ گر گئے۔''(۷)

۳۰ مئی بروز جمعۃ المبارک شکاگو کے ایک ممتاز عالم دین احمد زکی نے آپ دونوں کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ نماز جنازہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور متعدد یورپی ممالک سے مسلمانوں نے بڑی تعداد (تقریباً چار ہزار) میں شرکت کی۔

شخصیت:

ڈاکٹر راجی الفاروقی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کی گفتگو نہایت منطقی اور استدلال سے بھرپور ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اگر کوئی انہیں مل لیتا تو ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ جدید اور قدیم علوم خاص طور پر تقابلِ ادیان میں اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ آپ مسلمانوں میں تحریک احیائے علوم کے قافلہ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ شیخ حسن البناء شہید، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سیّد قطب کے نظریات سے متاثر ہی نہیں بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کی وفات سے تحریک آزادی فلسطین کی قیادت میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا آپ نے اسے پُر کیا۔ مسئلہ فلسطین زندہ رکھنے میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ سابق اٹارنی جنرل پاکستان خالد اسحاق ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر راجی الفاروقی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے بارے میں جو کچھ کہا شاید ان کی شخصیت کا اس سے بہتر تجزیہ نہ ہو سکے۔ ان کے الفاظ میں:

''فاروقی صاحب کو میں تقریباً ۲۲ سال سے جانتا ہوں ان سے پہلی ملاقات پاکستان میں ہوئی جب وہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے کے لیے پاکستان میں کچھ عرصہ تعینات

رہے۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ یہ کام انہوں نے زندگی کے آغاز سے شروع نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک ریسرچ اسکالر کی زندگی کے بہت سے مراحل طے کرکے آرکیٹکچر کے میدان میں خاصی کامیابی حاصل کرنے کے بعد بنے تھے انہوں نے دولت کا راستہ چھوڑا اور ایک اسلامی اسکالر کی مقابلتاً تنگ دستی کی زندگی کو اپنایا اور اس راہ پر گامزن رہے۔ یہاں تک کہ قاتل کے وار نے ان کو ان کے مالک سے ملا دیا۔ ان کا میرا ساتھ کئی مرحلوں پر ہوا اور دنیا میں بمشکل کوئی اسلامی کام کرنے والی انسٹی ٹیوشن ہوگی کہ جس میں فاروقی صاحب فعال حصہ نہ لیتے تھے۔ ان کے جوش اور ولولہ کے ساتھ ایک خاص خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری ہے اور اس کا تجربہ مجھے اسلامک کونسل آف یورپ کے لیے اسلامی دستور کی مسوّدہ سازی کے دور میں ہوا یوں تو اسلامی حقوق انسانی ابتدائی ڈرافٹ انہوں نے تیار کیا بعد میں جناب صلاح الدین صاحب مدیر تکبیر اور میں لندن پہنچے۔ ہم نے ایک متبادل ڈرافٹ تیار کیا۔ یہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کی وسعت قلبی تھی کہ انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اور بلا کسی حیل و حجت کے ہمارے ڈرافٹ کو اپنا لیا اور بہت ہی کھلے دل کے ساتھ ہماری بات مان لی۔ مجھے اس شخص کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوا کہ نہ صرف یہ ایک جوشیلا اور پُر خلوص انسان ہے بلکہ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی وسعت قلب بھی رکھتا ہے۔ جس کی کوئی اور مثال مجھے اس دور میں کم نظر آتی ہے۔'' (۸)

آپ کی شخصیت پر بہترین تبصرہ ان الفاظ میں کیا جاسکتا ہے:

'' آپ صائب الرائے، حاضر دماغ، زیرک اور منصوبہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ مسائل پر نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے گھنٹوں غور کرتے۔ کبھی بھی جذباتی انداز سے اپنی فکر کو آلودہ نہیں کیا۔ لیکن جب کسی مسئلہ پر غور و فکر کے بعد اسٹینڈ لیا تو پھر کبھی بھی اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے تاوقتیکہ مخالف نے علمی انداز سے آپ کو قائل نہ کرلیا ہو۔ آپ کے لیے اگر مردِ

میدان (Bold in Combat) کی اصطلاح استعمال کی جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر راجی الفاروقی مسلمانوں کے علمی زوال کا اسلامی ممالک کی قیادت کو ذمّہ دار گردانتے تھے۔ آپ حکمرانوں کی خودغرضی، دولت کی ہوس، تنگ نظری، اسلامی نظریات سے فرار اور باہمی تفرقہ کے حوالہ سے اکثر اپنے مضامین میں نکتہ چینی کرتے تھے۔ آپ کے ایک قریبی دوست ڈائریکٹر آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، عالمی ادارہ افکارِ اسلامی۔"(۹)

ڈاکٹر سیّد سعید کے الفاظ میں:

"مسٹر اینڈ مسز فاروقی کا ثانی ملنا بہت مشکل ہے۔ ان کے قتل نے نہ صرف یہ کہ شمالی امریکہ کے مسلمانوں میں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں متحد اور متحرک رہنے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اس ادارے (عالمی ادارہ افکارِ اسلامی) کا پروگرام کے مطابق مستحکم اور متحرک ہونا اس احساس کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یقینی طور پر نظام کو درست رکھنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن کام کو جاری رکھنے کے لیے سخت ارادہ بھی موجود ہے جو فاروقی دور کا ورثہ ہے۔"(۱۰)

ڈاکٹر فاروق آسمان علم وادب کا ایک ایسا جگمگاتا ہوا ستارہ تھا جس کی یاد مدتوں رہے گی۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں مختلف علوم پر پندرہ ہزار کتب تھیں جو پانچ سو سینتیس (۵۳۷) بکسوں میں بند تھیں۔ اب یہ کتب "عالمی ادارہ افکارِ اسلامی" کی ملکیت ہیں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اسلامی علوم کی تدریس اور تحقیق کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ خاص طور پر آخری دس برسوں میں تو گویا آپ علمی اور تحقیقی کاموں میں اس حد تک منہمک ہو گئے تھے کہ دن رات کا بھی ہوش نہیں تھا۔ آپ مسلمانوں کے لیے تعلیمی میدان میں مغرب سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ مغربی نظامِ تعلیم پر آپ کو اعتماد نہیں تھا۔ آپ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ مسلمانوں میں خرابی کی اصل جڑ مغربی طرز پر قائم یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم میں مضمر ہے۔

آپ کے الفاظ میں:

"یہ ادارے جن افراد کو ڈگریاں دے رہے ہیں وہ مغربی دانشوروں کی ہو بہو تصویر ہوتے

ہیں۔لیکن حقیقت میں یہ نہ تو مغربی اور نہ ہی اسلامی اسکالر ہوتے ہیں جب ایک اسلامی اسکالر مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ خالی الذہن ہوتا ہے، اسے اسلام کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہوتا۔اس کی نامکمل تربیت مغربی انداز سے ہوئی ہوتی ہے۔''(۱۱)

آپ مغربی نظامِ تعلیم میں جس طرح کی اصلاح چاہتے تھے وہ سیّد احمد خان اور مفتی محمد عبدہ کے تعلیمی پروگراموں سے بالکل مختلف تھی۔آپ کے ذہن میں مسلمان نوجوانوں کے لیے جو تعلیمی خاکہ تھا وہ امام غزالیؒ کے احیائے علوم الدین میں دیے گئے پروگراموں سے ملتا جلتا ہے۔

آپ روایاتی دینی مدارس سے فارغ نوجوان پر اعتماد نہیں کرتے تھے کیونکہ دنیا میں کسی بھی جگہ روایتی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ جدید خطوط پر تربیت یافتہ نہیں۔جبکہ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ اسلامی فکر سے آشنا نہیں۔آپ اسلامی علوم کی تجدید اور مغربی تربیتی نظام کی اسلامی نقطۂ نظر سے دوبارہ تشکیل چاہتے تھے۔ڈاکٹر فاروقی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش مافوق الطبعیاتی اور روحانی ہے نہ کہ تاریخی اور سیاسی۔

ڈاکٹر فاروقی متعدد بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کے رکن تھے۔یہ تنظیمیں اور ادارے یورپ اور امریکہ میں مستشرقین کا علمی میدان میں مقابلہ کر رہے ہیں۔اس کے علاوہ آپ متعدد علمی جرائد کے ایڈیٹر اور مشاورتی کمیٹیوں میں بھی شامل رہے۔ان جرائد میں قابلِ ذکر ''جرنل آف دی ریلیجن اینڈ سائنس''، ''جنرل آف ساؤتھ ایشیاء اینڈ مڈل ایسٹ اسٹڈیز'' تھے۔آپ نے مختلف موضوعات پر پچیس کتب بھی تحریر کیں۔چند ایک معروف کتب کے نام ذیل میں دیے جارہے ہیں:

- Trilogue of Abrahamic Faiths, 1982
- Atlas of Islamic Culture and Civilization.
- Historical Atlas of Religions of the World 1974
- Life of Muhammad (Peace be upon him) (Translation from Arabic
- to English 1976)
- Uruba and Religion 1962

- Christian Ethics 1967
- Great Religions
- The Origin of Zionism and Judaism
- Islamic Thought and Culture
- Tawhid 1982
- A Historical and systematic analysis of its Dominant Ideas 1967
- Christian Mission and the Islamic Dawah 1982
- Towards Islamic English (27)

مراجع وحواشی:

(۱) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۵۳

(۲) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۵۷

(۳) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۱

(۴) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۰

(۵) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۵۴

(۶) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۵۵

(۷) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۵۵

(۸) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۳

(۹) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۴

(۱۰) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۵

(۱۱) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۶

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا اثر ونفوذ

ایک تاریخی جائزہ

جہاں آراء لطفی*

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد تین واضح مرحلوں میں ہوئی۔اول وہ جنوبی ہند کے ساحلوں پر بطور تجار اور مبلغین آئے،جن کی تبلیغ سے راجہ چیرامن پیرومل جن کا تعلق چیرا سلطنت یعنی ریاست''کیرالا'' سے تھا اسلام کی طرف راغب ہوا،قبول اسلام کے بعد اس نے اپنا نام تاج الدین رکھا۔یہ ہند میں اسلام کی آمد کا بہت عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے جس کو زیادہ نمایاں نہیں کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد دوسرے مرحلے میں مسلمان بنی امیہ کی فتوحات کے بڑھتے ہوئے ریلے میں آئے جو انھیں دریائے اردن،سیر دریا اور دریائے سندھ تک لے آیا سندھ میں اسلام پہلی صدی ہجری کے اواخر یعنی ۹۳ھ بمطابق ۷۵۰ء میں داخل ہوا اسی مناسبت سے اسے''باب الاسلام'' کہا جاتا ہے سندھ کی فتح کے بعد اہل عرب اور اہل سندھ کے درمیان جو گہرے رشتے قائم ہوئے ان کے اثرات پورے برصغیر تک پھیل گئے ان روابط نے بنیادی طور پر اسلام کی ترویج واشاعت کے سلسلے کو وسیع کیا خصوصاً سندھ میں علوم دینیہ کو سیکھنے سکھانے کی لگن اور شوق اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ سندھ اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا جن میں سب سے نمایاں مقام علم تفسیر و علم حدیث کو حاصل ہوا ،تیسرے مرحلے میں مسلمان انتہائی منظم طریقے پر وسطی ایشیا کے ترکوں اور افغانوں کی فتوحات و ہجرت کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان پہنچے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اہل تاریخ پر روشن ہے کہ ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا،خشکی سے اور تری سے۔خشکی کا راستہ درہ خیبر تھا جہاں سے ترکوں،پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب تاجر اور سوداگر کی حیثیت میں سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر

---

*ڈاکٹر،اسسٹنٹ پروفیسر(ریٹائرڈ)،شیخ زید اسلامک سینٹر کراچی یونیورسٹی

پھیل چکے تھے وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے تھے اور اس سے سالہا سال تک پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے یہاں مسلمانوں، عربوں اور عراقیوں کی نو آبادیاں قائم تھیں اور مسجدیں آباد تھیں یہ مسجدیں اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں، جن میں وہ بیٹھ کر **قال اللہ** اور **قال الرسول** کا آوازہ بلند کرتے تھے۔[۱]

یہی وجہ تھی کہ سندھ کے رستے صرف مسلمان ہی نہیں آئے بلکہ اس خطہ زمین کی خوش بختی آئی نور ہدایت کی اس لہر نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے اور سرزمین ہند میں آج اللہ اور اس کے رسول کے تقریباً ۴۰ کروڑ ماننے والے موجود ہیں۔[۲]

مسلمانان ہند کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اہل ہند اور سندھ کو کہیں بھی اور کبھی بھی قبول اسلام کے لئے مجبور نہیں کیا گیا برصغیر کے رہنے والے بخوشی و برضا و رغبت اسلام میں داخل ہوئے اس میں سب سے اہم واقعہ سلطنت ''چیرا'' یعنی کیرالا کے راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے جس کا ہم نے تمہید میں بھی ذکر کیا ہے اس واقعے کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

''ہندوستان کے جنوب میں مغربی ساحلی علاقے ''مالا بار'' میں ایک بڑی قدیم روایت مشہور ہے کہ اسی علاقے کہ بادشاہ ''چکر وتی فرماوس'' نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ جو مکہ میں واقع ہوا اس بادشاہ نے جب اسی حوالے سے تحقیقات کیں تو اسے پتہ چلا کہ عرب میں ایک پیغمبر کے ظہور کی پیش گوئیاں موجود ہیں اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اس پیغمبر اسلام کا ظہور ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کر کے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے عرب روانہ ہو گیا اور اس نے ہادی کون و مکاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا پھر آپ ﷺ کے حکم پر واپس ہندوستان روانہ ہو گیا۔ راستے میں یمن کی بندرگاہ ظفار میں اس کا انتقال ہوا۔ یہاں آج بھی اسی ہندوستانی بادشاہ'' کے مزار پر لوگ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ انڈیا آفس میں ایک پرانے مسودے (نمبر عربی 2807 صفحہ 152 تا 173 میں اس کی تفصیل درج ہے۔ **زین الدین المعبری کی تصنیف ''تحفۃ المجاھدین فی بعض اخبار البرتقالین**'' میں اس کا تذکرہ ہے۔[۳]

پروفیسر علی اثر نے اپنے تحقیقی مقالے ''ہندوستان کی پہلی مسجد'' میں لکھا ہے کہ،

'' ہندوستان کی پہلی مسجد جسے دنیائے اسلام کی دوسری جامع مسجد ہونے کا بھی شرف حاصل ہے صوبہ کیرالا کے صدر مقام کو ڈونگلو میں (Kodunglae) واقع ہے ''کوڈونگور'' کیرالا کے قدیم راجاؤں کا پایہ تخت تھا۔ کیرالا کی اس قدیم ترین مسجد کی تعمیر صحابی رسول حضرت مالکؓ بن دینار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں فرمائی۔ ہندوستان کی یہ مسجد ''چیرامن

پیرومل جمعہ مسجد'' کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چیرامن پیرومل میوزوریس(Muzuries) جس کا جدید نام ''کوڈ نگالور'' ہے ''کیرالا'' ہند راجہ تھا جس نے معجزہ شق قمر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔'' [۴]

پروفیسر صاحب آگے لکھتے ہیں۔ چیرامن پیرومل نے اسی معجزے کی تصدیق کے لئے تاج وتخت اپنے بھتیجے کے حوالے کر کے مکہ معظمی کا سفر کیا اور سرور کائنات کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوا اور اپنا اسلامی نام ''تاج الدین'' رکھا لیکن عہد ماضی کی یادگار کے طور پر وہ اپنے لئے ''عبداللہ سمدری کا نام پسند کرتا تھا۔[۵]

اس واقعہ کا ذکر صحابی رسول ابوسعید خدریؓ نے بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''ہندوستان کے کسی راجا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گھڑا انجبیل (سونٹھ یا ادرک) کا بھیجا۔ آپ نے ایک ایک ٹکڑا سب صحابہ کو جو وہاں موجود تھے کھلایا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے آپ ﷺ نے دو ٹکڑے کھلائے۔'' [۶]

خلافت راشدہ تک ہندوستان کے راجوں کا تعلق ایران کی بادشاہت سے بحثیت باجگزار اور ماتحت تھا مگر اموی دور میں جب ایران کی شہنشاہیت ختم ہو چکی تھی ہندوستان کے راجاؤں کو ان سے نجات مل گئی اور وہ مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے ہندو مذھباً یہ مزاج رکھتے ہیں کہ اپنے نجات دہندہ کو تعظیم دے کر بعض اوقات دیوتا کا درجہ بھی دے ڈالتے ہیں سو مسلمانوں کو نجات دہندہ مان کر انہوں نے اموی خلافت کو اپنا سرپرست تسلیم کر لیا اس طرح وہ اموی حکومت کے ماتحت ہو گئے۔ گویہ فضا تادیر قائم نہ رہ سکی لیکن اسلامی اثرات ان پر مرتب ہو چکے تھے چنانچہ ایک صدی گزر جانے کے بعد جوں جوں فضا سازگار ہوتی گئی یہاں کے راجے مہاراجے اسلام کی طرف متوجہ ہونے لگے اس ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور تبلیغ اسلام کے بہترین نتائج کا دور کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق:

''محمد ابن خطیب البغدادی نے جو ابن قتیبہ کے استاد ہیں اپنی کتاب ''المحبر''میں لکھا ہے کہ ہر سال فلاں مہینے میں ''دبا'' نامی مقام پر ایک میلہ لگا رہتا تھا جس میں شرکت کے لیے سمندر پار سے لوگ آیا کرتے تھے، ان لوگوں میں ایرانی بھی ہوتے تھے، چینی بھی ہوتے تھے اور ہندی بھی اور سندھی بھی ہوتے تھے، مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے اور مغربی لوگ بھی ہوتے تھے۔'' [۷]

ابو حفص محدث بصری جوایک سند کے مطابق کتاب تصنیف کرنے والے پہلے مسلمان تھے،عربوں کی فتوحات کے ابتدائی زمانے میں سندھ آئے۔[۸]

ڈاکٹر زبید احمد ''عربی ادبیات میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ'' میں لکھتے ہیں: ''وہ تبع تابعین میں سے تھے اور اس لحاظ سے وہ احادیث روایت کرنے کی بنا پر اس شہر میں مرکزی اہمیت کے حامل ہوں گے اور امکانات کے پیش نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں منصورہ (بھکر) دیبل (ٹھٹھہ) اور ملتان اسلامی علوم وفنون کے مرکز بن گئے تھے۔[۹]

''ہندوستانیوں کے جوق در جوق اسلام قبول کرنے میں جبر وطاقت کا استعمال شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ برصغیر کی ایک چوتھائی آبادی کے اسلام قبول کرنے کے کئی مختلف اسباب تھے۔ پہلے تو یہ بات ہوئی کہ اسلام ان خطوں میں زیادہ تیزی سے پھیلا جہاں اسلام کی آمد تک بدھ مت ابھی باقی تھا۔ مثلاً جزیرہ نما کے کچھ شمال مغربی حصے اور کچھ مشرقی حصوں میں ہندوستان کے ساحلوں پر مسلم تجار اور آبادکاروں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے کو ہندو راجاؤں نے نہ کچھ زیادہ اہمیت دی اور نہ ان سے کوئی خطرہ محسوس ہوا چنانچہ ان علاقوں میں لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر جن کی تعداد بہت قلیل ہوتی تھی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔[۱۰]

عجم کی فتوحات کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں شروع ہوا اور حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں اسلامی سلطنت جنوب کی جانب ہرات اور بلخ تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ۹۳ھ میں اموی دور حکومت میں مکمل ہوا جبکہ ولید بن عبدالملک سلطنت اسلامی کے فرمانروا اور حجاج بن یوسف کوفہ کے گورنر تھے۔ حجاج کے بھتیجے محمد بن قاسم نے ۱۷ سال کی عمر میں دیبل کے راستے سندھ میں داخل ہو کر سندھ فتح کیا۔ اس وقت سندھ پر ہندو بادشاہ راجہ داہر حکومت کر رہا تھا اس معرکے میں مسلمانوں نے سندھ کا ایک وسیع علاقہ فتح کیا اور راجہ داہر قتل کر دیا گیا۔ کثیر مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔[۱۱]

المسعودی ''مروج الذهب'' میں لکھتا ہے:

'والمسافته من المولتان الى المنصوره خمسة وار بعون فرسخا سندية على ماذكرنا والفرسخ تمانيه اميال وهم نوع من السند و غير هم من الاجناس ،وهم ثفرالسند وكذلک المولتان من ثفور السند و مما اضيف اليها من العما ئر والمدن۔[۱۲]

ترجمہ: ملتان سے منصورہ کا فاصلہ سندھ کے حساب کے مطابق پینتالیس فرسخ ہے اور ایک فرسخ آٹھ میل کا ہوتا ہے یہ سندھ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے اور اسی طرح ملتان بھی سندھ میں داخل ہونے کا ایک دروازہ ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی اور

بستیاں اور شہر ہیں۔

آگے لکھتا ہے:

واما الاقالیم السبعة فاولها ارض بابل منه ، خراسان وفارس والا هواز والموصل وارض الجبال والاقليم الثانى ، الهند والسند والسودان ۔[۱۳]

ترجمہ: دیکھا جائے تو سات بڑے بڑے خطوں میں بابل ،خراسان ، فارس ، اھواز ،موصل ،اور پہاڑی علاقہ ہے جبکہ دوسرے بڑے خطے ہندوسند اور سودان ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں عربوں نے سب سے پہلے سندھ فتح کیا۔سندھ پر عربوں کی حکومت کے حوالے سے یہ بات قرین از قیاس نہیں کہ ان شہروں میں جو عربوں کے عہد حکومت میں بہت خوشحال تھے کوئی عالم نہ ہوا جو ہمیں علم ہے کہ ابو حفص محدث بصری جو ایک سند کے مطابق کتاب تصنیف کرنے والے پہلے مسلمان تھے عربوں کے ابتدائی زمانے میں سندھ آئے تھے۔[۱۴]

بلاذری کے بیان کے مطابق عمر بن عبدالعزیز نے ان راجاؤں مہاراجاؤں کو خطوط ارسال فرمائے وہ لکھتا ہے۔

فكتب عمر بن عبدالعزيز الى الملوک يدعوهم الى الاسلام والطاعة على ان يملكهم ولهم ماللمسلمين وعليهم ما على المسلمين۔

بلاذری کہتا ہے کہ ان راجاؤں میں سے راجہ جے سیہ جو داہر کا بیٹا تھا اور دوسرے راجا مسلمان ہو گئے اور انہوں نے اپنے نام عرب ناموں کے جیسے رکھ لیے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں ہندوستان کے راجوں کو دعوت اسلام دی جس پر انہوں نے لبیک کہا اور پندرہ راجے بیک وقت مسلمان ہو گئے یہی نہیں بلکہ اپنے ہندو نام ترک کر کے عربوں کے طرح اسلامی نام رکھ لیے۔ یہاں کے ایک راجہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا اور گرانقدر تحائف بھیجے۔[۱۵]

عباسی دور میں بھی یہاں کے راجے مہاراجے مسلمان اور اسلام سے گہری عقیدت رکھتے تھے مہدی عباسی کی دعوت اسلام پر یہاں کے کئی راجے مسلمان ہوئے جن میں پورس خاندان کا ایک راجہ بھی شامل تھا۔[۱۶]

۲۵۹ھ میں سندھ کا ایک راجہ مسلمان ہوا جس نے کعبے کے لیے گرانقدر نذرانہ پیش کیا۔خلیفہ مامون کے زمانے میں ایک راجہ مسلمان ہوا جس نے کعبہ کے لیے گرانقدر نذرانہ پیش کیا۔خلیفہ مامون کے زمانے میں سندھ و تبت کے ملے جلے علاقے کا ایک راجہ مسلمان ہوا اور ایک شاہی تخت کعبہ کے لیے نذر کیا ،خلیفہ معتصم کے دور میں کشمیر، ملتان اور کابل کے درمیانی علاقے

عسیفان کے راجہ نے برضا ورغبت اسلام قبول کیا اور مسلمان تاجروں کو بلا کر توحید کی تعلیم حاصل کی یہ واقعہ ۲۱۸ سے ۲۲۸ء تک کے درمیان پیش آیا [۱۷]

سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں۔

''قرآن پاک کا ترجمہ لوگ آج ہندی میں کرنے لگے ہیں مگر یہ سن کر کتنا اچنبھا ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے قرآن پاک کا ترجمہ ہندی میں یا سندھی میں ایک راجا کے حکم سے کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ ۲۷۰ھ میں ایک شاعر نے جو عراق سے تعلق رکھتا تھا اور سمجھدار تھا راجہ مہروگ کے حکم سے کیا راجہ روزانہ ترجمہ سنتا اور اس سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔''[۱۸]

سرندیپ (لنکا) ہندوستان کا علاقہ تھا، یہاں کے عوام اور راجے مہاراجے اسلام اور مسلمانوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ، عرب تاجر زمانہ قدیم سے یہاں آتے جاتے تھے، بعد میں یہاں مسلمانوں کی آبادی ہوگئی تھی، عہد رسالت میں یہاں کا ایک وفد مدینہ منورہ کے لئے چلا جو عہد فاروقی میں وہاں پہنچا اور واپس آکر حضرت عمر کی سادگی اور عدل وانصاف کو بیان کیا ، یہاں کے راجے ومہاراجے خلفائے اسلام سے بے حد محبت کرتے تھے، خلیفہ ولید کے زمانے میں یہاں کا ایک راجہ مسلمان بھی ہوا تھا۔[۱۹]

''گجرات کے مہاراجگان بلہرا اوران کی رعایا عربوں اور مسلمانوں کے شیدائی تھے اوران کے بارے میں انتہائی عقیدت اور حسن ظن رکھتے تھے یہ راجے ہندوستان کے تمام راجوں سے بڑے تھے اور یہاں کے تمام حکمراں ان کے سامنے سرنگوں رہا کرتے تھے ، گجرات اور سوراشٹر سے لے کر کوکن اور مہاراشٹر تک ان کی حکومت تھی اس کے باوجود وہ راجے اوران کے عوام مسلمانوں کے دلدادہ رہا کرتے تھے۔''[۲۰]

ہندوستان سے متصل علاقہ بامیان اسی زمانے میں ہندوستان میں شمار ہوتا تھا وہاں کے راجے رتبیل کے خاندانی لقب سے مشہو رتھے۔ مامون کے زمانے میں رتبیل نے اسلام قبول کر کے مامون کی خدمت میں تازہ ہلیلہ کابلی کا ہدیہ بھیجا۔ جیسا کہ فتوح البلدان میں بھی ہے۔[۲۱]

واظهر ملكها الاسلام والطاعة وادخلها عامله واتصل اليها البريد بعث اليه منها باهليلج غض ثم استقامت بعه ذلک حينا۔[۲۲]

ترجمہ: اس (علاقے) کے راجا نے اسلام اور اطاعت کو قبول کیا خلیفہ کے عامل کو منظور کیا ڈاک کے نظام سے منسلک ہوا اور

خلیفہ کو ریاست کی جانب سے تازہ ہلیلہ کا تحفہ بھیجا یہ ریاست ایک زمانے تک قائم رہی۔

تبت کے ایک راجا نے اسلام قبول کیا اس کے پاس انسانی شکل کا سونے کا ایک بت تھا جس کے سر پر سونے کا ایک تاج تھا جس میں جواہر یاقوت سرخ، یاقوت سبز اور زبرجد جڑوائے تھے یہ بت ایک تخت پر رکھا ہوا تھا جس کے پائے سونے چاندی کے تھے اس پر دیبا کا فرش تھا جس کی جھالریں روپہلی تھیں راجہ نے بعد میں یہ بت اور اسی کے تخت کو مامون کے پاس خراساں بھیجا اور کہلایا کہ یہ کعبہ کے لیے نذر ہے مامون نے اسے اپنے وزیر حسن بن سہل کے پاس بھیج دیا اور اسی کو ۲۰۱ھ میں بلخ کے ایک فوجی امر بن نصیر بن ابراہیم اعجمی کے ذریعے مکہ المکرّمہ بھیج دیا گیا اور حج کے موقع پر اسلامی شان وشوکت کے اظہار کی غرض سے اس کی نمائش ہوئی جب حجاج منیٰ سے واپس ہوا تو نصیر الدین ابراہیم اعجمی نے صفا اور مروہ کے درمیان رحبہ عمر ابن خطاب میں اس تخت پر فرش بچھا کر بت کو رکھا جو تین دن تک پڑا رہا اور نصیر بن ابراہیم کا بھانجا محمد بن سعید اس کی نگرانی کرتا تھا اس کے ہاتھ میں چاندی کی تختی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ **بسم اللہ الرحمن الرحیم ،ھذا سریر فلاں ابن فلاں ملک تبت اسلم وبعث ھذا السریر ھدیۃالی الکعبہ فاحمد اللہ الذی ھداہ الا سلام** ۔ترجمہ: بسم اللہ الرحمان الرحیم یہ تخت فلاں ابن فلاں تبت کے بادشاہ کا ہے اس نے یہ تخت کعبہ شریف کو ہدیہ کیا ہے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے اسے اسلام کی جانب ہدایت دی[۲۳]

ہندوستان میں عرب لوگوں کی موجودگی اور عربی زبان کی آمیزش بالکل بھی نئے عہد کی بات نہیں بلکہ یہ چند صدیوں پرانی بھی نہیں۔ یہ تو ہزاروں سال پرانا رشتہ ہے جو اگر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے سراندیپ میں اتارے جانے پر اعتبار کر لیا جائے یا اگر طوفان نوح کے تنور کے حوالے سے بات ہو جس کی جائے وقوع سندھ میں موہن جوڈرو کے نزدیک بتائی جاتی ہے اور اگر گجرات کی طویل قبر کو ابن آدم کی قبر مان لی جائے تو یہ رشتہ انسانی تاریخ کے بالکل ابتدائی عہد کا رشتہ ثابت ہوتا ہے۔

جناب سید سلیمان ندوی نے عرب ہند کے تعلقات کے حوالے سے جن دلائل کو پیش کیا ہے وہ واقعی حیرت میں ڈالنے کافی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مہابھارت کے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے لوگ تھے جو عربی زبان سے واقف تھے گو مشکل سے اس کا یقین آ سکتا ہے تاہم چونکہ ایک بڑے پنڈت نے اس کو مانا ہے اس لیے مجھے اس کے انکار کی جرات نہیں۔''

''ستیارتھ پرکاش'' کے مصنف سوامی دیانند جی نے گیارہویں سولاس (پہلا پرو، ادھیایہ ۱۴۷) میں لکھا ہے:

''مہابھارت میں جب کورووں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودرجی نے یوھشٹر جی کو عربی زبان میں بتایا اور یوہشٹر جی نے اسی عربی زبان میں جواب دیا۔''

سلیمان ندوی کہتے ہیں: ''اگر یہ سچی ہے تو عربوں اور ہندوؤں کا رشتہ کتنا پرانا ثابت ہوتا ہے۔[۲۴]

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ایک بڑا اہم تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ''سلطنت دہلی کا نظم حکومت'' ہے۔اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے دہلی کی سلطنت کو اسلامی سلطنت کا ایک مضبوط اور شاندار حصہ ثابت کیا ہے۔ان کی یہ تحقیق دلوں میں پیدا ہونے والے بہت سے شکوک وشبہات کو زائل کرتی ہے اور بہت سے سوالات کے جوابات دیتی ہے۔لکھتے ہیں:

''ہندوستان کا مسلمانوں سے سیاسی رابطہ پہلی مرتبہ اس وقت قائم ہوا جب محمد بن قاسم نے سندھ کو مسخر کیا (۷۱۱-۷۱۳ء)۔اس موقع پر اس مسئلے کا فیصلہ ہوا کہ ہندووں کے ساتھ مسلمانوں کا کیا طرزعمل ہونا چاہیے۔کیا ہندوؤں کے ساتھ ذمیوں اور معاہدوں کے جیسا سلوک کیا جائے اور انھیں چھوٹا سا شریک بنا لیا جائے یا ان کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کو انتہائی درجے تک پہنچایا جائے؟ مسلم فقہا کے درمیان اس بارے میں اختلاف رائے تھا مگر رواداری اور سیاسی دانش مندی کی فتح ہوئی اور ایک ایسی نظیر قائم کردی گئی جس کی تقلید بعد میں آنے والے فاتح اور حکمران عہدہ داروں کی حیثیت سے مقرر کیا اور ان کے سرداروں کے ساتھ التفات سے پیش آیا۔اس نے خراج ادا کرنے کی شرط پر ان کے مقبوضات ان ہی کی تحویل میں چھوڑ دے۔ان اصولوں کو ہندوستان میں حکمت عملی کی اساس قرار دیا گیا۔[۲۵]

آج برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کو ظالمانہ اور غاصبانہ اقدام ثابت کرنے والوں کو جو حقائق کی پردہ پوشی کر کے مخاصمت اور عداوت کو ہوا دے رہے ہیں اور ایک طویل عرصے سے محض سیاسی مفادات سمیٹنے کی خاطر پاک و ہند میں بلکہ خصوصاً ہندوستان میں خلفشار، بے چینی، خانہ جنگی اور نفرت کا ماحول پیدا کرتے چلے آرہے ہیں یہ دلائل ان کیے مذموم مقاصد کی پردہ دری کے لئے کافی ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی تحقیقی مقالے میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:''ہندوستان کی تاریخ میں سلطنت دہلی کا قیام اسی قسم کا ایک درآفرین نشان ہے اور ہمایوں کی بحالی دوسری حد فاصل ہے۔[۲۶]

اہل ہند نے مسلمانوں کی زبانوں کو بھی بے حد اہمیت اور پذیرائی دی ان زبانوں کو نہ صرف سیکھا بلکہ ان میں اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ اہل زبان بھی دنگ رہ گئے ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو بھی زور دے کر واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ،

''فارسی، ترکی اور عربی میں ہندوستان کے ماہرین ان ممالک کے مقامی متبحر علماء سے با آسانی سبقت لے جاسکتے تھے۔ غیر ملکی مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ ان کی زبانیں ہندوستان میں کس قدر فصاحت کے ساتھ بولی جاتی ہیں۔[۲۷]
دہلی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا شہر تھا جس میں حسن کے ساتھ ساتھ قوت اور لطافت کے آسائش سموئی ہوئی تھی۔[۲۸]
ضیاءالدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے:

''دہلی بہت پہلے ''قبۃ الاسلام ''(اسلام کا گنبد) کا لقب بجا طور پر حاصل کر چکی تھی۔''[۲۹]

شاید ہی آج کوئی یہ بات جانتا ہو کہ دہلی کو یہ عظیم الشان خطاب ملا تھا۔ جبکہ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور طبقوں اخصوصاً ہندو مسلم کے درمیان ہم آہنگی اور امن پیدا کرنے والا ماحول پیدا کیا جائے، جو اپنے اپنے مذہبی دائروں میں رہتے ہوئے تحمل اور برداشت پر مشتمل ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ،
''سن ہجری کی پہلی تین صدیوں میں سندھ عربوں کی ایک نو آبادی تھی جہاں کئی قبیلوں کے لوگ آباد ہو گئے تھے، ان عربوں کی مادری زبان ایک طویل عرصے تک یقیناً عربی ہی رہی ہوگی اور ان میں بہت سے شاعر بھی پیدا ہوئے ہوں گے۔''[۳۰]
اسی طرح کچھ عرب سندھ میں آ کر آباد ہو گئے تھے جبکہ بہت سے سندھیوں نے بھی عرب میں سکونت اختیار کی تھی۔ ان میں غلام بھی تھے اور آزاد بھی۔ ابو معشر ایک محدث تھے اور ان کو سیرت نبوی کا مستند عالم سمجھا جاتا تھا۔ ایک عالم کی حیثیت سے ان کو جو مقام و اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا اس کا اندازہ اس واقع سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو خلیفہ ہارون الرشید خود ان کے جلوس جنازہ میں شریک ہوئے اور نماز جنازہ پڑھائی۔[۳۱]
عہد فاروقی میں ۲۳ھ سے عہد غزنوی میں ۴۱۶ھ تک ہندوستان کے اسلامی مقبوضہ پر تقریباً چار سو سال خالص اسلامی عربی حکومت رہی اور خلفائے راشدین، خلفائے بنو امیہ و خلفائے عباسیہ اور امرائے عرب نے اپنے اپنے دور میں یہاں ایک ہی نظام جاری رکھا جو مجموعہ اعتبار سے خالص اسلامی نظام حکومت تھا۔[۳۲]
مروج الذہب میں مسعودی نے یہاں پر رہنے والے مسلمانوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، اس نے چیمور اور اسی کے آس پاس کی بستیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں میں نے دس ہزار کے قریب مسلمانوں کو دیکھا جن میں بیاسرہ، سیرافی، بصری بغدادی اور دیگر شہروں سے تعلق رکھنے والے ہیں، وہ ان علاقوں میں شامل ہو کر رچ بس گئے ہیں، ان میں بڑے بڑے تاجر ہیں۔ اس کے بعد وہ بیاسرہ سے متعلق لکھتا ہے: ''یہ وہ نسل ہے جو عربی شوہر اور ہندی بیوی سے پیدا ہوئی۔''[۳۳]

''مسلمانوں نے یہ عادت بنالی تھی کہ جہاں جہاں جاتے وہاں کی بودوباش اختیار کرتے وہاں کے لوگوں میں گھل مل جاتے ان کے ساتھ معاشرتی ومعاشی روابط رکھتے اوراس حسن سلوک کے ذریعے ہرقسم کی تفریق کوختم کرنے کی کوشش کرتے یہی اسلام کی طرف راغب کرنے کا طریقہ کارتھا جس کے ذریعے انہوں نے خاطرخواہ کامیابی حاصل کی اورمقامی لوگ جوق درجوق اسلام میں داخل ہوئے مسلمانوں نے جس ملک یا شہر میں قدم رکھا روزاول ہی سے اسے اپناوطن بنایاحتیٰ کہ وہاں پیدا ہونے والے بچوں کے نام اسی ملک یا شہر کی نسبت سے رکھے۔امیر خراساں مسلم بن زیاد کے ساتھ ان کی بیوی ام محمد بنت عبداللہ بن عثمان بن ابوالعاصی ثقفی تھیں۔مسلم بن زیادان کولے کرمقام سعد کے جہاد پر گئے ،وہاں ایک بچہ پیداہواجس کا نام سعدی رکھا گیا۔'' [۳۴]

''اموی دور میں ہندوستان کے دینی،علمی،فکری اورذہنی کیف وکم میں نہایت خوش گواراضافہ ہوااورعرب ہند نے ایک دوسرے کے علم وفن سے حصہ لیا۔اس وقت دونوں طرف سے ایسے زبان دان موجود تھے جو ہندی سے عربی اورعربی سے ہندی میں ترجمہ کرتے تھے۔حضرت امیر معاویہ اورحضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں چین اور ہندوستان کے راجوں نے ہندی علوم وفنون اوراسرار وحکم پر مشتمل کتابیں روانہ کیں۔ہمارے علم وتحقیق میں عرب و ہند کے درمیان یہ پہلا علمی سلسلہ تھا جو اسلام فہمی کے داعیہ پر جاری ہوااورخالد بن یزید نے اس کتاب سے خوب خوب استفادہ کیا۔اگر یہ کتابیں یہاں سے عربی زبان میں روانہ کی گئی تھیں تو یہاں عربی کے ماہرین موجود تھے جنھوں نے ان کومرتب کیا تھااوراگر ہندی میں تھیں تو عرب میں اس زبان کے جاننے والے موجود تھے جنھوں نے ان کوعربی میں منتقل کیا تھا۔[۳۵]

اموی دوراس لحاظ سے تابناک دورکہلاتا ہے کہ اس دور میں اگر عالم اسلام کی سرزمین میں اضافہ ہورہا تھا اورفتوحات کے ذریعے اسلامی سلطنت کی حدود میں وسعت آرہی تھی تو دوسری جانب علما،مفسرین،محدثین،مبلغین اپنااپنا کام بھی پوری تندہی اوردیانت داری سے انجام دینے میں مصروف تھے۔ہندوستان اسی میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ابن کثیرالبدایہ والنہایۃ میں واضح پر بیان کرتاہے کہ

''وکان فی عساکر ھم و جیوشھم فی الغزو الصالحون والاولیا ء و العلما ء من کبار التابعین فی کل جیش منھم شرذمہ عظیمتہ ینصرالله بھم دینہ ۔[۳۶]

نہ صرف یہ بلکہ یہاں آنے والے عرب نژادمحدثین نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر ہندوستان آتے اور یہاں احادیث رسول بیان فرماتے۔چند کے نام یہ ہیں:

عبیداللہ بن ایاد بن لقیط ثقہ محدث ہیں سلم بن ذیال ثقہ وصالح الحدیث تھے ، عمارہ بن عمیر تمیمی سنان بن سلمہ ھذ لیؓ (تابعی) نے اپنے والد سلمہ بن محبق ہذلی، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے حدیثیں بیان فرمائیں۔ عمر بن عبیداللہ بن معمر قرشی تمیمی نے ابان بن عثمان سے روایت کیا۔

مہلب بن ابی صفرہ ازدی نے عبداللہ بن عمر عبداللہ بن عمرو، براء بن عازب سے روایت کیا۔ ان کے علاوہ کرز بن ابو کرز برہ بن حارثی، ابوایمان بن معلیٰ بن راشد نبال حذلی، عباد بن زیاد بن ابی سفیان، سعید بن اسلم بن ذرعیہ کلابی، معاویۃ بن قرہ بن ایاس فرنی، زائدہ بن عمر طائی، عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفیؒ، موسیٰ بن سنان، حکم بن عوانہ کلبی مجاہد بن سعیر تمیمی، محمد بن ہارون عبن زراعہ، قیس بن ثعلبہؓ، جنید بن عمرو، محمد بن زید، ابوشیبہ جوہری، زید بن حواری، یزید بن ابو کبشہ، ہلال بن احوز، مفصل بن مہلب ابوعینہ بن مہلب ازدی، محمد غزان کلبی، منصور بن جمہور کلبی، ابوالحسن معلیٰ بن زیاد بن حاضر فردوسی بصری، یہ وہ نام ہیں جو مولانا اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' میں بیان فرمائے ہیں۔[۳۷]

مولانا لکھتے ہیں جس طرح عرب محدثین ہندوستان میں احادیث وسنن کی تلقین و روایات میں مصروف تھے اسی طرح خود ہندوستان کے بعض خانوادے اور افراد عرب میں سنن واحادیث کی روایت اور اسلامی علوم ومعارف کی تعلیم وتلقین کی خدمت انجام دے رہے تھے جن میں وہ ان خانوادوں کا ذکر کرتے ہیں۔

آل بیلمانی:

یہ ہندی اصل خاندان مقام بھیلمان (سوراشٹر) خلافت راشدہ میں عرب پہنچا غالباً یہ پہلے یمن کے علاقے نجران میں آباد تھے اور وہیں کسی غزوے میں گرفتار ہو کر مدینہ منورہ لے جائے گئے۔ یہ ''مولیٰ عمرؓ'' اور ''مولیٰ آل عمرؓ'' بھی کہلاتے ہیں۔[۳۸]

آل ابی معشر سندی:

اس دور میں سندھ کا دوسرا دینی وعلمی خاندان اس ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی مدینہ منورہ میں تھا، جس میں مدتوں علماء محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوتے رہے۔ یہ ''مولیٰ بن ہاشم'' کہلائے کیونکہ ان کے مورث اعلیٰ سندھ سے عرب جا کر بنی ہاشم کی اولاد میں رہے۔[۳۹]

آل مقسم قیقانی:

اموی دور میں قیقان کا ایک خاندان عراق میں علم حدیث میں صدیوں تک مشہور رہا جس میں نامور علما ومحدثین پیدا ہوئے۔[۴۰]

امام مکحول سندی شامیؒ:

اموی دور کے ہندی الاصل ائمہ اسلام میں مشہور حافظ حدیث وفقیہ حضرت امام ابوعبداللہ مکحول سندی شامی بھی ہیں۔ آپ نے حضرت ابوامامہ باہلی، حضرت واثلہ بن الاسقع، حضرت انس بن مالک، محمود بن ربیع عبدالرحمٰن غنم، ابوادریس خولانی ابوسلام عطور کے علاوہ علماء کی ایک بڑی جماعت سے روایت کی ہے۔[۴۱]

الامام اوزاعی:

آپ کے لیے امام ذہبی اور امام ابوزرعہ دمشقی نے فرمایا کہ ان کی اصل سندھ ہے جبکہ دیگر کئی مورخین آپ کے عرب اصل بتاتے ہیں۔[۴۲]

فی، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندی مدنی کے بارے میں خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ:

کان اعلم الناس بالمغازی۔ ترجمہ: وہ مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے۔

ایک مرتبہ ان کے بیٹے محمد بن ابومعشر نجیح سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے والد نے علم مغازی کیسے حاصل کیا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے استاد کے پاس حضرات تابعین بیٹھ کر مغازی کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور میرے والد یاد کرلیا کرتے تھے، ان کی کتاب المغازی کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے جسے ان کے بیٹے اور پوتے نے روایت کیا ہے۔[۴۳]

اور ابن ندیم نے لکھا ہے:

عارف بالاحداث والسیر و احد المحدثین۔[۴۴]

ہندی الاصل امام مکحول کو فقہ میں خاصی شہرت حاصل ہے۔ ابوحاتم کا قول ہے:

مااعلم بالشام افقہ من مکحول۔[۴۵]

محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو انہوں نے دیبل میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ علاقہ بسایا جس میں تقریباً چار ہزار کے قریب مسلمانوں کو آباد کیا جس میں مساجد بھی تھیں امام اور خطیب بھی تھے نیز قضاء کا محکمہ بھی تھا، فتوح البلدان میں ہے کہ،

واختط محمد للمسلمین بھا و بنی مسجداً و انزلھا اربعۃ الآف

ترجمہ محمد (بن قاسم) نے وہاں (دیبل میں) مسلمانوں کے لئے ایک علاقہ تشکیل دیا جس میں ایک مسجد بنائی اور چار ہزار مسلمان وہاں آباد کئے۔[۴۶]